سقوطِ مشرقی پاکستان کا واقعہ اور تاریخ نویسی

نسرین افضل*
توقیر فاطمہ**

ABSTRACT:

The separation of East Pakistan (1971) has left a deep affect on the psyche of the people of Pakistan. Individuals who actually participated in the event, or those affected by the separation, wrote their experiences in the form of autobiography and memoirs. The importance of autobiography and memories can hardly be overvalued as a form of historical writings and as a source material for historians. The value of the work depends on the objectivity of the author, his first-hand knowledge and understanding, and his attitude to the issue. Even when there is a possibility of one sided interpretation of historical data as a result of the personal involvement of the author, autobiography and memoirs still remain the valuable material for historians, especially for shedding light on controversial issues. In this paper two accounts have been selected written by the individuals belonging to different background that have participated in the event and had intimate knowledge of the debacle. Through these works, this paper aims to understand the effects of the event of 1971 on the history writing and tried to highlight the biases, source material and its interpretations by the people of different background.

اس تحقیق کا عنوان "۱۹۷۱ء (سقوط مشرقی پاکستان) کا واقعہ اور تاریخ نویسی" ہے۔ یہ موضوع پاکستان کی تاریخ کے اُس دور سے وابستہ ہے۔ جس میں پاکستان کا ایک بازو الگ ہوگیا۔ یہ واقعہ پاکستانی قوم کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس سانحہ کی وجہ سے قوم دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ اس صورت حال نے دونوں بازوؤں کے سیاسی و سماجی اداروں کو متاثر کیا۔ وہیں اندرونی اور بیرونی "تاریخ" پر بھی اثرات مرتب کیے۔ اس وجہ سے اس واقعہ کے نتائج اور مابعد اثرات آج تک "تاریخ" پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ دوسرے اُس واقعہ کا تعلق صرف پاکستانی قوم سے نہیں رہا بلکہ اس میں ہندوستان اور ہندوستانی قوم بھی شامل ہے۔ اس لیے بین الاقوامی سطح پر جو ممالک ان دونوں ممالک کے اندرونی حالات میں دلچسپی رکھتے تھے اُن کے لیے یہ ایک انتہائی سودمند موقع تھا کہ وہ دونوں اقوام کے جذبات و احساسات کو استعمال کرتے ہوئے اپنے

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تاریخ عمومی، جامعہ کراچی　　برقی پتا: jhss@uok.edu.pk
**ریسرچ اسکالر، شعبہ تاریخ عمومی، جامعہ کراچی
تاریخِ موصولہ: ۲۰۱۲/۱۰/۱۰ء

سیاسی و معاشی مقاصد و اہداف حاصل کریں۔ ۱۹۷۱ء کا یہ واقعہ جس دور حکومت میں پیش آیا وہ آمرانہ نظام سیاست تھا اور پاکستان کی تاریخ میں دوسرا مارشل لاء عہد تھا۔ تاریخ کے اس منظر نامے نے عوام و خواص کی سوچ و فکر کے دھارے کو مختلف سمتوں کی جانب موڑ دیا۔ لہذا بیشتر کتب، اداریئے، مضامین تحریر کیے گئے جس میں مورخ، محقق اور دانشور نے اپنا اپنا زوایہء نظر پیش کیا اور یہ تمام مصنفین خود بھی مختلف حلقہء فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے تعلقات بھی اندرون و بیرون ملک دونوں ہی تھے۔ موضوع کی مناسبت سے اس مقالے کے لیے دو تصانیف کو منتخب کیا گیا۔ ان کتب کے مورخ مختلف سماجی پس منظر رکھتے ہیں۔ ایک کا تعلق فوج سے اور دوسرے کا تعلق عوام الناس میں سے ہے۔

چونکہ ۱۹۴۷ میں تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان میں "تاریخ" کو رقم کرنے کا رجحان جس طرح ادیب، دانشور، علماء، فضلاء میں پایا گیا ویسے ہی افواج پاکستان میں بھی پایا گیا۔ اس کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ پاکستان کی پینسٹھ (۶۵) سالہ تاریخ میں تقریباً تیس سال فوجی حکومتیں قائم ہوئیں۔ جب کہ باقی ادوار میں جمہوری حکومتوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی، لیکن یہ کتنے تعجب کی بات ہے جس قدر بے اطمینانی اور غیر تسلی بخش حالات جمہوریت میں نظر آتے ہیں آمرانہ عہد میں نہیں آتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آمرانہ حکومتوں میں ملک کی فضا غیر اطمینان بخش ہوتی نہیں یا پھر ان حالات کو عوامی حلقوں تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔ چنانچہ ان تمام حالات کو بیان کرنے کے لیے کس قسم کی تاریخ نویسی کو فروغ دیا گیا۔ خصوصاً فوجی عہد میں لہذا اس تحقیق کے لیے اس عنوان کا انتخاب کرتے ہوئے مذکورہ بالا اسباب و حالات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

''۱۹۷۱ء (سقوط مشرقی پاکستان) کا واقعہ اور تاریخ نویسی''

تعارف

یہ دور پاکستانی تاریخ کا وہ اہم دور ہے جس میں پاکستان نے مشرقی پاکستان ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ مشرقی پاکستان کی اس علیحدگی کو عوام و خواص کے ذہنوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ پاکستان کو اپنی آزادی کے چوبیس سال کے دوران یہ دوسری جنگ تھی جو لڑنی پڑی۔ پہلی ۱۹۶۵ کی جنگ تھی اور دوسری ۱۹۷۱ کی جنگ۔ ان جنگوں اور اندرونی سیاسی انتشار کی وجہ سے پاکستان کے جمہوری و انتظامی اداروں میں اتنی مضبوطی نہیں آئی تھی جو ملک اتنا بڑا سانحہ اور اس کے اثرات سے محفوظ ہو جاتا۔ جس طرح سے باقی دوسرے اداروں میں تبدیلیاں آئیں وہیں "تاریخ'' بھی ان اثرات و شواہد سے محفوظ نہیں رہ پائی۔ چونکہ واقعہ کی نوعیت ہی ایسی تھی جس نے عوام سے لے کر خواص تک کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا اور ہر ذہن میں بے شمار سوالات در آئے۔ ملک کے دونوں بازوؤں کے رہنے والوں نے فوری طور پر اس علیحدگی کا ذمہ دار فوج کو سمجھا۔ شاید اس کا سبب مارشل لاء دور حکومت تھا۔ اس موضوع کو انتخاب کرنے کی وجہ یہی ہے کہ اس دور میں رقم کی گئی

تحریروں نے "تاریخ نویسی" پر کیا اثرات مرتب کیے؟ اور کس قسم کی تالیفات و تصانیف منظر عام پر آئیں؟ یہ تحاریر و مضامین سیاسی و سماجی، معاشی و مذہبی تمام پہلوؤں کا احاطہ کر رہے تھے۔ مگر یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ ان تحریروں کو رقم کرنے والے قلم کار، محققین، ادباء، سیاسی و سماجی لحاظ سے مختلف حیثیتوں کے مالک تھے۔ لہذا ان کے تعلقات اندرونی و بیرونی دنیا سے بالواسطہ اور بلاواسطہ موجود تھے اور ان کی تحاریر میں بھی کسی حد تک یہ اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس موضوع کو تحقیقی مقالے کے لیے منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عساکر کے تاریخی رجحان تک رسائی حاصل کی جا سکے کیوں کہ تقسیم پاکستان کے بعد تاریخ لکھنے اور لکھوانے کا رجحان جس طرح سے ادباء، فضلاء، علماء اور سیاست دانوں میں پایا گیا ویسے ہی افواج پاکستان میں بھی پایا گیا۔ جنھوں نے عساکر کی تاریخ کے ساتھ ساتھ پاکستان کی تاریخ کو مرتب کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس تحقیقی مقالے میں ایسی ہی دو تصانیف کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جن کی تحریری نوعیت مختلف ہے۔ منتخب شدہ کتب میں ایک ڈاکٹر صفدر محمود کی تصنیف ہے اور دوسری میجر جنرل فضل مقیم خان کی تصنیف ہے۔ موضوع تحقیق کی مناسبت سے متون کا موازنہ اور بیان کردہ محرکات اور واقعات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ بھی کرنا تھا۔ جس کے لیے ضروری تھا کہ اس عہد کی چند اور عصری اور غیر عصری تصانیف کا طائرانہ اور کسی کسی جگہ گہرائی سے جائزہ لیا جائے۔ اس ضمن میں جن تحریری دستاویزات تک رسائی حاصل ہوئی ان میں "پاکستان و ہندوستان میں سیاست اور سپاہ گری کی روداد" میجر جنرل شیر علی خان پاٹودی، "حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ"، احمد سلیم "پھر مارشل لاء آ گیا" پروفیسر غفور احمد "ھمہ یاران دوزخ"، "میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا" بریگیڈیئر صدیق سالک "کورٹ مارشل"، جلیس سلال "جنرل محمد یحییٰ خان (شخصیت و سیاسی کردار)"، منیر احمد، "ہتھیار کیوں ڈالے"، وسیم احمد "The story of my struggle" میجر جنرل تجمل حسین ملک، Memory of L.T جنرل گل حسن خان،) شامل ہیں ان میں سے کچھ کتب کو تحقیق میں کسی کسی جگہ بطور حوالہ بھی استعمال کیا گیا ہے تا کہ بیان کردہ واقعات و محرکات کو استنیاد حاصل ہو جائے۔

تعارف مصنف

ڈاکٹر صفدر محمود کا نام علمی و ادبی حلقوں کا معزز نام ہے، مورخ کا تحقیقی میدان علم سیاسیات (Political Science) ہے۔ پاکستان کے اعلی عہدوں پر بھی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جن موضوعات پر کتب اور اداریئے تحریر کیے۔ اُن کا تعلق پاکستان کے تاریخی و آئینی ارتقاء سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب، سقوطِ مشرقی پاکستان: تاریخی و سیاسی تجزیہ، کا انتخاب اس تحقیقی مقالے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس تصنیف کو مکتبہء لائبریری لاہور نے جولائی ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ لہذا یہ ابتدائی ماخذ ہے اس دور کے بارے میں۔ خود مصنف نے اس کو تحریر کرنے کا جواز یہ بتایا ہے کہ حادثہ کیونکہ سنگین تھا۔ اس لیے ملک اور قوم پر اداسی چھا گئی اور عوام و خواص کافی عرصے تک اس عہد کے اثرات سے نہیں نکل سکے۔ اگرچہ

غیر بنگالیوں نے اور افواج پاکستان کے نے بھرپور کوشش کی تھی ملک کا دفاع کرنے اور دیرینہ دشمن سے نپٹنے کی۔جبکہ ہندوستان نے ۱۹۴۷ء سے ملک کو توڑنے کی جو سازش تیار کی تھی وہ بلا آخر ۱۹۷۱ء میں کامیاب ہوگئی۔مصنف نے اُن حالات کا تجزیہ کیا ہے جو اس حادثے کا سبب بن گیے۔

دوسری تصنیف میجر جنرل مقیم خان کی "پاکستان کا المیہ ۱۹۷۱ء ہے" مصنف کا تعلق بری فوج سے ہے اس تالیف کو عالمی ایجوکیشن پریس راولپنڈی نے ۱۹۷۲ء کے آخر میں شائع کیا۔اس تصنیف پر سنِ اشاعت درج نہیں تھا۔لیکن بحریہ کی مرکزی لائبریری کے دفتر کے مطابق (اس تحقیق میں دفتر کا لفظ لیجر کے لیے استعمال ہوا ہے) جنوری ۱۹۷۳ء میں یہ کتاب لائبریری میں آچکی تھی۔مصنف کے مطابق یہ تصنیف ایک سپاہی پر لکھی گئی ہے اور ایک سپاہی نے لکھی ہے۔اس تصنیف میں اُنہوں نے بری افواج کا اُن کے اُوپر لگائے گے الزامات کا دفاع کیا ہے۔اور یہ ثابت کیا ہے کہ سپاہی صرف جنگیں لڑنا ہی نہیں جانتا بلکہ سیاسی وسماجی تبدیلیاں اس کی ذات پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔میجر صاحب نے اُن گورنرز کا ذکر کیا ہے جو مشرقی پاکستان کے حالات کو بات چیت کے ذریعے پُر امن تصیفہ کی طرف لے جانا چاہتے تھے بغیر کسی جبر کے۔ اُن میں جنرل گل حسن، ایم۔اے مالک، ایڈمرل حسن۔ائیر مارشل نور خان اور صاحبزادہ محمد یعقوب شامل ہیں۔جو اس دوران مشرقی پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔اس تصنیف کو تحریر کرنے کا دوسرا جواز یہ بتایا ہے کہ ایوب خان کے عہد حکومت میں انہیں ۱۹۶۵ کی جنگ پر تجزیہ کرنے سے روک دیا گیا تھا۔دوسرے مارشل لاء عہد میں " Pakistan crisis in leadership'' تحریر کی۔اس کے مشہور ہونے کی وجہ سے میجر صاحب کے دوستوں نے ان پر دباؤ ڈالا کہ اس طرح کی کوئی اور کتاب اردو زبان میں تحریر کریں۔اُسکی وجہ یہ تھی کہ انگریزی کتاب صرف مخصوص طبقے کے زیر مطالعہ رہے گی۔اور اردو تصنیف عام لوگوں تک پہنچے گی۔تا کہ تمام افراد حقائق سے واقف ہوسکیں۔اور اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنف نے پاکستان کو پیش آنے والے حادثے پر کوئی الزام بین الاقوامی اقوام کو نہیں دیا ہے اور کسی قسم کا کوئی بہانہ بھی نہیں بنایا بلکہ یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی سازش کامیاب ہوتی ہے تو اس میں داخلی عناصر بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔تمام اسباب ومحرکات کو سچائی کے ساتھ رقم کرنے کی ضرورت تھی میجر فضل مقیم خان نے بھی مشرقی پاکستان اور وہاں کے سیاسی و سماجی حالات پر تبصرہ کیا ہے۔

منتخب متون کا تقابلی جائزہ

اس تحقیق کا عنوان "۱۹۷۱ (سقوط مشرقی پاکستان) کا واقعہ اور تاریخ نویسی" ہے اس تحقیقی مقالے میں دو متون کا جائزہ لیا گیا۔اس جائزے میں مصنفین کے انداز تحریر پر تبصرہ کیا ہے۔یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ تاریخ میں مورخ، ادیب دانشور کی تحریریں اپنے اپنے نقطہ نظر سے بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں ایسے میں اس تحقیق کے لیے منتخب متون بھی "تاریخ"

کے باب کا ایک حصہ ہیں۔اس تحقیق میں مصنفیں کے انداز تحریر کی وجہ سے جو تضادات ہیں یا جو اطلاعات ومعلومات مشترکہ ہیں انہیں شامل کیا گیا ہے۔اُس کے ساتھ بعض اقتباسات بھی شامل کیے گے ہیں جو مشترکہ معلومات پر مبنی ہیں لیکن انداز و بیان کی وجہ سے اُن کے معنی ومطالب تبدیل ہو گئے ہیں۔بعض حالات کے بیان کے لیے کہیں کہیں عبارت و اقتباس الگ الگ نقل کر کے اُن پر بحث کی گئی ہے۔اور بعض مرتبہ عبارت کو یکہ بعد دیگرے تحریر کر کے اور کہیں کہیں اقتباسات کے مرکزی خیال کو سامنے رکھ کر اپنے الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ جگہ سند کے لیے دوسری تالیفات سے بھی مدد لی گی ہے۔یہ ایسے اقتباسات وعبارات ہیں جن پر مصنفین کے انداز بیان نے پردہ ڈالا ہو یا سیاسی و سماجی دباؤ کی وجہ سے ضبطِ تحریر میں نہیں لائے جا سکے ہوں۔تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آمرانہ ادوار میں "تاریخ" کی تصویر کو کیسے مسخ کیا جاتا ہے۔یا کس قسم کے حقائق سے عوام الناس کو آگاہ کیا جاتا ہے؟ اس تحقیق میں سقوط مشرقی پاکستان سے وابستہ انہی پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔

آزادی کے بعد پاکستان کی حکمت عملی

میجر صاحب کے بیان کے مطابق، پاکستان صرف اپنے تحفظ اور سلامتی پر یقین رکھتا ہے۔جبکہ بھارت 'بغل میں چھری منہ میں رام رام، کے مصداق اپنی نفرت انگیز اور جارحانہ پالیسی پر عمل پیرا ہے۔"(۱)

صفدر محمود کے بیان کے مطابق "سقوط مشرق پاکستان کے تصور سے ہی خون تیزی سے رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ذہن میں شعلے لپکنے لگتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وجود زیست جل کر راکھ ہو جائے گا۔احساس ہزیمت کا نشتر ہمہ وقت رگ جاں میں چبھتا ہے۔ہندوستان نے ہمیں جو پارہ پارہ کرنے کی سازش ۱۹۴۷ء میں شروع کی تھی۔وہ ہمارے عدم تدبّر کی وجہ سے دسمبر ۱۹۷۱ء میں کامیاب ہو گئی"(۲)

ان دونوں عبارات میں ایک نکتہ مشترک ہے کہ ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہندوستان کی وجہ سے پیش آیا۔صفدر صاحب نے لفظ ہمارے کا استعمال کر کے کسی حد تک اپنی غلطیوں کی جانب اشارہ کیا ہے۔وہیں میجر صاحب نے برائے راست ہندوستان کو الزام دیا ہے۔ان اقتباسات میں جو نکتہ قابل غور ہے جس کے اثرات "تاریخ" پر مرتب ہوئے وہ ہے "جذباتیت" دونوں نے قاری کو جذباتی کرنے کی کوشش کی ہے۔میجر صاحب نے غیر محسوس طریقے سے کیوں کہ "بغل میں چھری منہ میں رام رام" کا محاورا ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔وہ صرف یہ سمجھے گا کہ ہندوستان نے ہم سے جنگ کی اور ہم نے دفاع کیا۔یہ ایک مدبرانہ انداز ہے۔اس کے برعکس صفدر صاحب نے احساس ہزیمت، وجود زیست، راکھ، خون کا رگوں میں گردش کرنا۔جیسے جملے استعمال کر کے براہ راست جذبات کو برانگیختہ کیا ہے۔اس طرز کی تحریر کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں فوراً یہ خیال آئے گا کہ ہندوستان یقیناً ہمارا جانی دشمن ہے۔اور اس نے ہمیں اس قدر نقصان پہنچایا اور ہم کچھ نہ کر سکے۔

ہندوستانی حکمت عملی پاکستان کے ساتھ

عبارات بالا میں جیسے پاکستان کی حکمت عملی کو بیان کیا۔ ویسے ہی عبارات زیریں میں ہندوستان کی پالیسی پاکستان کے ساتھ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

میجر صاحب تحریر کرتے ہیں۔'ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہندوستان جانتا تھا کہ پاکستان ایک طفیلی ریاست بن جائے گا۔ کیوں کہ پنڈت نہرو نے یہ عتراف کیا کہ پاکستان "ماضی کی سیاسی غلطیوں کا نتیجہ " ہے۔لیکن پاکستان بننے کے بعد ہندووں نے اپنی ہزار سالہ تاریخ کو توڑ موڑ کر بیان کیا کہ ماضی میں مسلمانوں نے ہندووں کے جو حقوق ضبط کیے اور ان پر مظالم ڈھائے، "پرانے انتقام کی اس آرزو میں دیوانگی کی حد تک ہم سے ادھار کھائے بیٹھا ہے " لیکن پاکستان نے ہمیشہ اس کے ناپاک عزائم کو کامیاب نہیں ہونے دیا" (۳)

صفدر صاحب نے تحریر کیا۔''مسلمانوں کی ہمت اور استقلال کی داستانیں روشن ہیں بے شک ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں اور انگریزوں کی چالاکی کی وجہ سے مسلمانوں کی حکومت کھو گئی۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے انگریزوں اور ہندووں سے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا۔"ہمارا تعلق اُس ملت سے ہے جس کے اسلاف نے دریاؤں کے رخ موڑے ہیں"۔مسلمانوں نے اپنے کردار کی وجہ سے تمام دنیا پر حکومت کی لیکن جب ملت کا ایمان اور جذبہ ختم ہو گیا تو انھیں ایک طوفان بہا لے گیا۔اور وہ شکست خوردہ ہو گئے پاکستان بننے کے بعد نسلی اور علاقائی تعصّبات میں گھر گئے اور ذہنوں پر لالچ اور ہوس کی گہری دھند چھا گئی اور سیاسی رہنماؤں نے حصول اقتدار کی خاطر ملت اور قوم کے مفادات کو بیچ دیا، اسی وجہ سے ہندوستان نے مشرقی پاکستان الگ کر لیا۔'' (۴)

ان عبارات کی روشنی میں دونوں قلم کاروں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار ہندوستان ہی کو ٹھہرایا۔ایک مصنف کے خیال میں پاکستان کی علیحدگی خود ہندوستان کی پالیسیوں کی وجہ سے ہوئی۔اس کے برعکس دوسرے مصنف نے اپنی ماضی کی غلطیوں کے اعتراف کے ساتھ تاریخ ماضی کو اسی زاویہ نگاہ سے جوڑنے کی ضرورت سمجھی۔میجر صاحب نے تاریخ کے ان خدوخال کا ذکر کیا جو ہندوستان کے غلط سیاسی اقدامات کی وجہ سے تھے۔لیکن جب پاکستان بن گیا تو وہاں کے سیاسی حلقوں میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ ماضی کی غلطیوں کی وجہ سے پاکستان بنا اور اب وہ انتقام پر اتر آئے۔مگر پاکستان نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔مصنف نے اپنی پوری کتاب میں کہیں مسلمان فاتحین کا ذکر نہیں کیا۔انہوں نے اندرونی سطح پر در آنے والی خامیوں کا تذکرہ کیا ہے۔لیکن اس انداز تحریر میں کہیں پر بھی ملٹری کے وقار اور عزت پر حرف نہیں آنے دیا۔

صفدر صاحب نے حال کے مسائل کو ماضی کے فاتحین کی تاریخ کے تناظر میں دیکھتے ہوئے تحریر کیا ہے۔کیونکہ انہیں

پاکستانی قوم کے معماروں سے شکوہ ہے کہ ان میں کوئی بھی محمد بن قاسم جیسا جرنیل نہیں اور سرسید احمد خان اور علامہ شبلی نعمانی جیسا صاحب بصیرت نہیں۔ اس فکر کے تاریخ پر اثرات اس طرح سے مرتب ہوئے کہ ہم آج تک ماضی کے سنہرے دائرے میں قید ہیں اور حال کی حقیقتوں سے نظر بچا کر اپنی تمام غلطیوں کا ذمہ دار دوسری اقوام کو ٹھہراتے ہیں۔ اگرچہ کبھی اعتراف کرنا ہو تو ماضی کے اسلاف کے کارناموں کے بعد مندرجہ بالا طرز پر اپنی کمزوریوں کو قبول کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا عبارات کی روشنی میں دوسرا نقطہ یہ سامنے آتا ہے کہ دونوں ہی قلم کار ہندوستان کے لیے متعصب رویہ رکھتے ہیں اور افواج پاکستان کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

ہندوستان کی سیاسی روش ۱۹۶۵ء کے تناظر میں

اس تحقیق کے ضمن میں میجر فضل مقیم صاحب تحریر کرتے ہیں "۱۹۶۵ء کی جنگ بھارت کی توسیع پسندانہ پالیسی نہیں بلکہ جارحانہ پالیسی کے جنون کا نتیجہ تھی۔ لیکن پاکستان کو بھی اپنی ہزار سالہ تاریخ پر فخر رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے مغربی پاکستان کے میلوں پھیلے ہوئے محاذوں پر بھارتی سورماؤں کو پاکستان کی، جیالی اور نڈر فوجوں نے برتر ثابت نہیں ہونے دیا۔ لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس شکست کو بھارت نے بہت اچھے انداز سے برداشت کیا کیونکہ اس کے پاس اپنے جمہوری ادارے موجود تھے، جو اپنے صدمات اور واقعات کو جذب کر سکیں۔"(۵)

پیراگراف دیگر میں میجر صاحب تحریر کرتے ہیں۔ ''پاکستان کیونکہ ابتدائی طور پر اپنا سیاسی حریف رکھتا ہے۔ اس وجہ سے 'سلامتی' اور حفاظت کے لیے دفاعی اقدامات کرنا اس کا فرض ہے۔ ابتدائی عرصے میں ناکام ہونے والی جمہوری حکومتوں کی وجہ سے ملک کے جمہوری ادارے کمزور ہو گئے اور اس کے نتیجے میں ۱۹۶۵ کی جنگ ہوئی۔ اگرچہ اس جنگ کی وجہ سے عوام کا سوچنے کا انداز بدل گیا۔ چونکہ اس وقت تک سیاسی اور جمہوری ادارے بے لچک اور بے اثر ہو چکے تھے۔ وہ قوم کی اُس نئی بیداری کو نہیں سمجھے۔ اگر رائے عامہ میں سے کسی نے آواز اٹھائی تو اُسے توجہ کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ اور ہر اُس 'کوشش اور رائے کو سختی کے ساتھ کچل دیا گیا جس میں حکومت کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی تھی'۔ ان حالات کے تحت پاکستان کے سیاستدان بھی محدود دائرے میں سلامتی کی فکر کرتے رہے۔''(۶)

جبکہ اس ضمن میں صفدر محمود صاحب رقم طراز ہیں، ''ہمارے حالات 'شدید بحران' کا شکار تھے کیونکہ بین الاقوامی سطح پر ہم تنہا ہو چکے تھے۔ کیونکہ عالمی سیاست میں 'چڑھتے سورج' کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے دنیا نے بھارت کی مضبوط خارجہ پالیسی کی وجہ سے اُسے اہمیت دی جبکہ 'ہماری خارجہ پالیسی ہمارے تنہا ہونے کی ذمہ دار اور مالی امداد کے لیے بڑی طاقتوں پر انحصار ہے' ہم نے من حیث القوم اپنی اقتصادیات کو مضبوط نہیں کیا۔ 'اور جنگ میں کود گئے جس کے نتیجے میں نقصان اٹھایا' امریکہ نے ساتھ نہیں دیا اور بھارت، روس ایک ہو کر جنگ میں شامل ہوئے اور ہم نے غیور قوم" ہونے کا

خطاب کھودیا۔حالانکہ سیٹو اور سینٹو جیسے معاہدے بار بار یاد دلانیکی کوکوشش کی۔'' (۷)

عبارت بالا کی روشنی میں یہ نکتہ واضح ہے کہ ۱۹۶۵ کا واقعہ ہونے کے بعد جو سیاسی بے چینی شروع ہوئی اس دوران ہماری خارجہ حکمت عملی ناکام ہوگئی لیکن ان مسائل کے حل کے بجائے اندرونی ریشہ دوانیوں نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ صفدر صاحب نے معیشت کو کمزور بتاتے ہوئے ان پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے۔جبکہ میجر صاحب کا انداز مختلف ہے۔اور وہ کسی حد تک اداروں کی غیر فعالی کو نظاموں کی کمزوری قرار دیتے ہیں۔ یہ انہی صورتوں میں ہوتا ہے جب حکومتیں سیاسی شعور نہیں رکھتی ہیں اور اگر سماج کے باشعور لوگ اس جانب سے آگاہ بھی کرنا چاہیں تو ان کی آواز طاقت کے استعمال سے دبا دی جاتی ہے۔ایسے ماحول میں تعمیر نہیں تخریب ہی پنپتی ہے۔انہی رویوں کے سبب حکومت اور اس کی حلیف سیاسی جماعتیں اپنا اثر ورسوخ کھودیتی ہیں۔میجر صاحب نے بین السطور یہ تحریر کر کے اس جانب اشارہ کیا کہ ایوب خان کی حکومت میں کھلے عام بولنے پر پابندی تھی۔اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ کوئی اختیاری پابندی تھی یا غیر ضروری جبر کی حکمت عملی؟ تاکہ حقائق کو چھپایا جاسکے۔یا ایک حکومتی سطح پر کی گئی حکمت عملی تھی۔

پاکستان کے کمزور معاشی حالات

اس تحقیقی موضوع کے لحاظ سے معیشت بھی ایک اہم باب ہے۔اس کے متعلق صفدر صاحب تحریر کرتے ہیں "پرانی سیاست کے نئے شاہکار جمہوریت کے نام پر اپوزیشن کو کچلنے پر تُلے ہوئے تھے... پرانا نظام دم توڑ رہا تھا اور نیا نظام ابھرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔مزدور اور صنعت کاروں کی کش مکش نے پیداوار کو بُری طرح متاثر کیا۔سیاسی رہنما قوم کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔نہیں جانتے تھے کہ پہاڑ کے اُس طرف مغربی پاکستان کو بھی پارہ پارہ کرنے کی سازش کی جارہی ہے" (۸)

اس ضمن میں میجر جنرل تحریر کرتے ہیں۔"مشرقی پاکستانیوں نے بیرونی سرمایہ کاری اور سرمایہ داری کے خلاف ایک تعصب پیدا کرنا شروع کیا... آدم جی بھوانی" اصفہانی جیسے مشہور خاندان اور کئی دوسرے صنعت کار جنہوں نے مشرقی پاکستان میں صنعتیں قائم کیں سب بھارت سے آئے تھے اس طرح سے چند مغربی پاکستانی سرمایہ دار جو پہلے سے بھارت میں تجارت کرتے تھے... مغربی پاکستان میں ایسا کوئی تعصب موجود نہیں تھا" (۹)

عبارت دیگر میں میجر صاحب نے تحریر کیا" صنعتی لحاظ سے دونوں بازو پسماندہ تھے... مشرقی پاکستان میں سوائے ڈیمر اور ٹانگیل کے مشہور اور قدیم مسلمان جُلاہوں کے باقی تمام کاریگر طبقہ ہندو تھا۔لیکن مغربی پاکستان میں مسلمان کارکنوں اور محنت کشوں کی اکثریت تھی... انہوں نے نہ صرف ہندوؤں کی متروکہ صنعتوں کا انتظام سنبھالا بلکہ نئی صنعتوں کی بنیاد بھی رکھی" (۱۰)

میجر فضل نے تحریر کیا، "اقتصادی میدان میں مشرقی پاکستان کی پسماندگی کی وجہ غلط منصوبہ بندی تھی۔حصول آزادی

کے بعد ہم اپنے زرمبادلہ کا ساٹھ (۶۰ فیصد سے اسی (۸۰) فیصد پٹ سن سے کماتے تھے۔ زرمبادلہ کا بیشتر حصہ مغربی پاکستان میں صنعتیں لگانے پر صرف کیا گیا... منصوبے سے پہلے اور منصوبے کی مدت کے دوران مشرقی پاکستان کے وسائل مغربی پاکستان منتقل ہوتے رہے... علاوہ ازیں ان اعداد وشمار کے مطابق مرکزی حکومت نے مشرقی پاکستان کی معیشت کو ترقی دینے پر کم اور مغربی پاکستان کی صنعتی ترقی پر زیادہ توجہ دی"(۱۱)

عبارت بالا سے یہ تو واضح ہے کہ معاشی مسائل آہستہ آہستہ شدید نوعیت کے ہوتے جا رہے تھے۔ میجر صاحب نے دونوں اقتباسات میں یہ واضح کیا کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کا استحصال کر رہا ہے تو یہ بات غلط تھی کیوں کہ زیادہ صنعتیں مشرق میں اُن لوگوں نے لگائیں جو بھارت سے ہجرت کر کے مشرق میں آئے تھے۔ اور جو مغربی تجار تھے وہ تو تقسیم سے پہلے بھی تجارت ہی کیا کرتے تھے۔ اس بنیاد پر مشرق کا مغرب سے تعصب غلط تھا۔ اگر دائیں بازو کو نقصان ہو رہا تھا تو وہاں کے کاریگر کی وجہ سے کیونکہ وہ ہندو تھا۔ اس کے برعکس مغرب میں زیادہ تر لوگ محنت کش تھے۔ یہاں مصنف کا لہجہ متعصب ہو گیا اور مذہبی تعصب پایا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ ہندو بھی اب تو پاکستان کا حصہ تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض مسلمان خاندان صدیوں کے بعد بھی اپنے اندر سے "اشرافیہ" اور "فاتح" ہونے کے احساس کو ختم نہیں کر پائے تھے۔ اور یہ رجحان آج بھی ہماری افواج میں پایا جاتا ہے۔ اور ہمارے یہاں ہونے والی بغاوتوں کے ذمہ دار ہندو یا غیر مذاہب ہوتے ہیں یا پھر اقلیتیں ہوتی ہیں۔ اور آج بھی ہونے والے تمام واقعات کے ذمہ دار کبھی طالبان، آئی ایس آئی اور بھارت ہوتے ہیں۔ ہماری حکومتوں کی یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ ثابت کیا جائے کہ بھارتی یا روسی ایجنٹ تھے۔ صفدر صاحب نے بھی بھارت کو ہی مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ چونکہ صفدر صاحب نے مزدور اور صنعت کار کے درمیان باہمی نا اتفاقی کو ان حالات کا اصل سبب قرار دیا اور اس سے تیسرے ملک نے فائدہ اٹھایا۔ مقامی حکومتیں بھی ان اقتصادی مسائل کی اتنی ہی ذمہ دار ہیں جیسے دوسرے عوامل۔ کیونکہ اُن کی معاشی حکمت عملی مشرق کے لیے صحیح نہیں تھی۔ ان میں چند مسائل تو ایسے تھے جنھیں انگریزوں نے اپنے عہد میں حل کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ معاشی لحاظ سے یہ غیر منصفانہ تقسیم بھی دونوں بازوں میں منافرت کا سبب بنی۔

مشرقی پاکستان اور قوم پرستانہ جذبات

اس تحقیق کے مضمرات میں ایک قوم پرستانہ انتہا پسندی بھی شامل ہے۔ جنھیں انگریزوں نے مشرق کے مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ ابھارا۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے تحریر کیا" پاکستان نظریاتی ملک ہے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے پاکستان کے حریفوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ پاکستان ایک کمزور، نظریئے کی بنیاد پر قائم ہوا۔ چونکہ مشرقی پاکستان کی سقوط کا بڑا سبب بھارت کی کھلی جارحیت بھی ہے، جغرافیائی پہلو سے دیکھا جائے تو مشرقی پاکستان وہ خطہ تھا جو سب سے پہلے انگریزوں کے

قبضے میں چلا گیا تھا اور مغل دور سے ہی زیادہ آمدنی پیدا کرنے والا علاقہ تھا۔اسی وجہ سے یہ خطہ 'سنہرا دیس' کہلاتا تھا۔ سرکاری شہری اور افواج کے تمام' کلیدی' عہدے دار مسلمان تھے۔عیش و آرام سب انھیں میسر تھا۔اونچے طبقے سے تعلق کی بنا پر زندگی کے ہر شعبے میں نمائندگی تھی۔" علم کی شمعیں روشن تھیں مدارس کا جال بچھا ہوا تھا... انہیں لوگوں کی بدولت مسلم ثقافت نے ترقی کی" اسی وجہ سے یہ لوگ بنگال میں سیاسی وسماجی استحکام پا گئے لیکن جنگ پلاسی میں،" نواب سراج الدولہ" کو اپنوں کی غداری سے جو شکست ہوئی یہ مسلمانوں کے زوال کا سبب بنی،(۱۲)

اسی طرح کی ایک اور عبارت میں صفدر صاحب لکھتے ہیں' ظالمانا رویئے تھے جن کی وجہ سے بنگالی عوام میں " سیاسی شعور" بیدار ہو گیا۔ جب کہ برصغیر کے دوسرے حصوں میں ابھی اس جذبے کا احساس نہیں تھا۔اور انہوں نے " چھوٹے چھوٹے گروہوں" کی حیثیت سے احساس دلایا۔ دوسرے ان کے اندر " اسلام" اور اس سے " محبت" بھی زیادہ تھی۔ جب ہی" سید احمد شہید" کی تحریک نے بنگال کو بچایا۔جبکہ اس کے برعکس پنجاب،سندھ اور دیگر علاقہ جات نے اس تحریک میں زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی تھی اس کے بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ میں نمایاں حصہ لیا یہی وقت تھا جب مسلم قومیت دکھائی اور اس کا احساس کیا۔اور انھیں لگا کہ ان کا" قومی تشخص" کانگریس بننے کے بعد خطرے میں ہے۔اس وجہ سے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام ڈھاکا میں ہوا اور یہاں" سید احمد خان اور ان کے ہم عصر عبداللطیف خان کلکتہ" نے مسلم نشاۃ ثانیہ کے ساتھ" محمڈن لٹریری ایسوسی ایشن" قائم کی یہ" ہندو جبر" سے نجات کا موثر ذریعہ تھا،(۱۳)

میجر فضل مقیم کے مطابق

''تحریک آزادی میں مشرقی پاکستان ہمیشہ سے آگے تھا۔اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ مسلم لیگ "ڈھاکا'' میں ہی بنی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان کے مسئلے پر بنگالیوں میں زیادہ اتفاق تھا۔ برطانوی حکومت نے اپنی استعداد کے مطابق ملک کے دونوں بازوؤں سے بھرپور " اقتصادی" فائدہ اٹھایا۔لیکن کیونکہ مشرقی پاکستان میں اس وقت قدرتی ذرائع موجود تھے۔اس وجہ سے وہاں کی پیداواری قوتوں پر" غاصبانہ'' قبضہ کرنے کی کوشش کی جب کہ مغربی پاکستان میں" فوج اور ادنی ملازمتوں کے لیے" افراد کا استحصال کیا۔لیکن یہاں کے" جاگیرداری اور سرداری" نظام کو کوئی زک نہ پہنچائی۔ برطانیوں کی اس دوہری معاشی وسیاسی حکمت عملی کے سبب مشرقی پاکستان میں ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس کے درمیان کوئی درجہ بندی نہیں تھی اور" مغربی پاکستان میں مثالی جاگیردارانہ" نظام رائج تھا۔''(۱۴)

ان متون میں دونوں مصنفین نے جس پہلے نکتے پر روشنی ڈالی ہے وہ" قومیت" کا تصور ہے۔یعنی سب سے پہلے بنگال انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ایسے میں وہاں کے لوگوں میں جلد متحد ہونے کا جذبہ بیدار ہوا اور" قوم" کا وہ تصور جو مشرقی پاکستان میں پایا جاتا تھا وہ مغربی پاکستان کے حصوں میں نہیں تھا۔مشرقی پاکستان کے لوگ جانتے تھے کے

سیاسی استحکام کے لیے جذبہءقومیت کس قدر ضروری اور مددگار رہوتا ہے یہ حب الوطنی کا احساس بعض مرتبہ اپنے سے بڑے اور طاقتور ممالک سے دفاع کے لیے کس قدر اہم ہوتا ہے۔ اس وقت بے شک مسلمانوں کے ادارے کمزور تھے اور انگریزوں نے اُن کے ذرائع آمدن پر قبضہ جمالیا تھا۔ یہاں دونوں مصنفین نے غیر جانبداری سے جذبہءقومیت پر تبصرہ کیا ہے۔اور مشرقی پاکستان کی وہ جدوجہد جو انہونے حصول پاکستان کے لیے کی۔ اس کے ساتھ ہی اسلام اور اسلامی اعتقادات کا جونظریہ مشرقی پاکستان میں موجود تھا اُسے سراہا ہے اور اسکے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے رہنے والوں میں، علاقائیت، اور فرقہ واریت کا تعصب زیادہ پایا جاتا تھا۔اس پر بھی تبصرہ کیا۔ دیگر اس جانب مکمل اشارہ ہے کہ آج بھی یہ مسائل پاکستانی معاشرے کا حصہ ہیں۔

تعلیمی نظام میں کس طرح علاقائی عصبیت کو ہوا دی

مشرق اور مغرب کے درمیان عداوت کی بڑی وجہ مشرق کا نظام تعلیم تھا جس کی وجہ سے علاقائی تعصب کی بنیادیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ متن زیریں میں ڈاکٹر صفدر رقم طراز ہیں:۔

'جس وقت پاکستان کی تحریک چلی مسلم قوم پرستی مشرقی پاکستان میں عام تھی۔اسی وجہ سے "خان عبدالقیوم خان" "ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی" "ڈاکٹر اشیاق حسین قریشی اور لیاقت علی خان" انتخابات میں کامیاب ہوئے "انہیں بنگالی عوام نے ووٹ دیئے" کیونکہ ہندوستان بھی اس "امر" سے اچھی طرح سے واقف تھا کہ جب تک مسلمان "مسلم نظریہ" کے تحت متحد ہیں انہیں توڑنا مشکل ہے۔اس وجہ سے اُس نے تعلیمی نظام کو ہتھیار بنایا۔ دراصل مشرقی پاکستان میں جو تعلیمی نظام تھا "اس پر ہندوؤں کا تسلط تھا" مدرس اور پروفیسر زیادہ تر ہندو تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بنگال کے مسلمانوں میں "بنگالی قومیت کا زہر" بھر دیا اشتہاری ذرائع بھی ہندوؤں کے زیر اثر تھے بنگالی زبان کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جانے لگا۔'(۱۵)

میجر جنرل فضل نے رقم کیا۔"ان کے ہندو استادوں اور پروفیسروں نے علاقائی عصبیت کا جو بیج بویا تھا وہ تناور درخت بن کر پھلنے پھولنے لگا تھا۔ چوبیس (۲۴ برس میں مشرقی پاکستان کے طلبا کو جس قسم کی تعلیم دی گئی... اپنے آپ کو پاکستانی سمجھنے کے بجائے بنگالی کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔"(۱۶)

"مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے مضمرات میں ایک اہم وجہ صوبائیت اور علاقائیت تھی۔ دونوں ہی مصنفین نے ان عناصر کا ذمہ دار مشرقی پاکستان کے نظام تعلیم کو ٹھہرایا ہے۔" تاریخ" پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے کہ ہندوستان کی وجہ ہی سے ہمارے درمیان کی عداوتین بڑھ گئیں اور علاقائیت کی عصبیت کا وہ بیج جو ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے بویا تھا ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد سے تناور درخت بن گیا اور اسی فرقہ واریت کو ۱۹۷۱ء میں ہندوؤں نے استعمال کیا مسلمانوں کے

خلاف۔ دونوں مصنفین نے مشترکہ تعلیمی نظام کو موردِ الزام ٹھرایا ہے۔اس کے علاوہ اس جانب بھی توجہ دلائی کہ اس تعلیمی نظام کی وجہ سے جو مسائل دونوں حصوں میں بڑھتے جارہے تھے اُسے مرکزی حکومت اور مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ نہیں سنبھال سکیں۔ اور مشرقی پاکستان کے عوام وخواص پاکستانی کے بجائے بنگالی بن گئے۔ یہ اندازِ تحریر اپنے اندر شدید جذباتیت کا رجحان رکھتا ہے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے رہنے والے من حیث القوم اپنے تشخص کو برقرار نہیں رکھ پائے۔دشمن عناصر نے اس فرقے واریت کو ابھرنے کے لیے "زبان" کو ہتھیار بنایا اور لسانی مسئلے کو بار بار اٹھایا تا کہ پاکستان کے دونوں حصوں میں کشیدگی برقرار رہے۔اس مسئلے کو ابھارنے میں پاکستان کے مشرقی پاکستان کے کمیونسٹ اشخاص نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر صفدر تحریر کرتے ہیں "چنانچہ جب حکومت نے اردو کو قومی زبان کا درجہ دینا چاہا تو ہندوؤں نے عوام اور طلبا کو یہ تاثر دیا کہ مرکز پر پنجابیوں کا قبضہ ہے اور بنگالیوں کو ان کی مادری زبان سے محروم کر کے ان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں... اس مسئلے کی آڑ میں اپنی شخصیت اور حیثیت کو منوانے کی جدوجہد کی اور زبان کی مخالفت کی بنا پر مقبولیت حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہو گئے ان ایام میں کمیونسٹ بھی مستعد تھی"۔(۱۷)

عبارت مذکور سے سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو کسی کی مادری زبان تھی؟ نہیں اردو را بطے کی زبان تھی۔ تقسیم سے قبل بھی یہ ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں بولی جانے والی زبان تھی۔اس کے علاوہ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل تھا وہاں رہنے والے اپنا اپنا ثقافتی پس منظر رکھتے تھے۔جن کی اپنی زبانیں، بولیاں اور لہجے تھے۔اس لیے اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا تا کہ تمام صوبے آپس میں متحد ہو جائیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اردو اس وقت ادب اور سماج کے دانشور طبقے کی زبان تھی۔اسی بنا پر جناح نے ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا "ملک کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی آپ ان لوگوں کے پھندے میں نہ پھنسیں جو پاکستان دشمن ہیں۔"(۱۸)

ڈاکٹر صفدر محمود کے نزدیک جس طرح سے بنگالی قومیت کو ابھرنے میں زبان اور مقامی حکمرانوں کی سیاسی چپقلیشیں اور مشرقی پاکستان کے ہندو اساتذہ ذمہ دار تھے ایسے ہی میجر صاحب کے نزدیک نسلی ولسانی عصبیت اور صوبائیت ابھارنے کے ذمہ دار جہاں سماجی ومعاشی رویئے تھے۔ ویسے ہی ۱۹۶۵ء کی جنگ بھی اس بنگالی عصبیت کو پھیلانے کا اہم سبب بنی تھی میجر صاحب کیونکہ ایک فوجی ہیں اسوجہ سے ۱۹۶۵ء میں درپیش مسائل اور فوجی رویئے سے واقفیت رکھتے ہیں۔۱۹۶۵ء کی جنگ وہ سبب تھی جس نے مشرقی پاکستان کی بنگالی قومیت کو یہ احساس دلایا کہ وہ مغرب کی ضرورت صرف ایک "نوآبادیات" کے طور پر ہیں برابری کے حقوق کی بنیاد پر نہیں۔سوال یہ ہے کہ یہ رجحان کیوں پیدا ہوا؟

میجر صاحب تحریر کرتے ہیں "مشرقی پاکستانیوں میں پاکستان کے بارے میں جو خوش فہمی تھی وہ ۱۹۶۵ء میں ختم ہوگئی۔ اسی سال انہوں نے ملک کے تمام اداروں اور صدارتی انتخابات میں فیلڈ مارشل ایوب خان اور ان کے نامزد امیدواروں کو

شکست دینے کی سخت کوشش کی مگر کوئی نمایاں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔اب انہیں یقین ہو گیا کہ موجودہ سیاسی نظام میں ان کی نمائندگی کے امکانات کچھ زیادہ روشن نہیں ہیں۔"(۱۹)

اقتباس دیگر میں میجر صاحب لکھتے ہیں: ''۱۹۶۵ء کی جنگ نے مشرقی پاکستان کے اوپر مغربی پاکستان سے زیادہ اثر چھوڑا، حالانکہ دونوں کے درمیان مضبوط رشتہ 'اسلام' تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ یکجہتی کے اس عمل کو دونوں حصوں کی افواج مضبوط کرتی تھیں جس میں اکثریت مغرب سے تھی۔لیکن اس کے باوجود مشرقی پاکستان کے لوگوں کو اس بات پر اعتراض نہیں تھا، بلکہ وہ افواج پر اعتبار کرتے تھے۔لیکن اس جنگ کے بعد ان کا اعتبار ختم ہو گیا''۔کٹّر قسم کے انتہا پسندوں کو موقع ملا تو انہوں نے افواہیں اور پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا۔(۲۰)

اس ضمن میں ڈاکٹر صفدر محمود نے تحریر کیا' پاکستان بننے کے بعد سیاسی اتار چڑھاؤ کی وجہ سے جس وقت ''خواجہ ناظم الدین وزیر اعلیٰ تھے مشرقی پاکستان کے'' سیاسی رقابتیں شروع ہو گئیں حکمران گروہ نے مسلم لیگی قیادت پر قبضہ کرنا چاہا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمران کے مخالفین کو تحریک کی رکنیت کے فارم نہ دیے گئے۔صرف ان لوگوں کو رکن بنایا گیا جو صوبائی قائدین کے حامی تھے اور عذر یہ پیش کیا گیا کہ فارم ختم ہو گئے ہیں۔مولانا بھاشانی جو تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن اور مسلم لیگ کے ممبر تھے۔پاکستان بننے کے بعد انہیں مسلم لیگ کی رکنیت کے فارم نہیں دیئے گئے۔اس نتیجے میں مولانا بھاشانی کے ساتھی کسان، مزدور اور کمیونسٹ طبقہ مسلم لیگ کے خلاف ہو گیا۔اس وجہ سے مسلم لیگ عوامی تحریک کے دائرے سے نکل کر خواص تحریک بن گئی ''۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۴ء تک صرف ایک ضمنی انتخاب ہوا'' جس میں مسلم لیگ کو ایک عام طالب علم کے ہاتھوں شکست ہوئی۔صوبائی حکومت اس قدر خوفزدہ ہو گئی کہ ۳۴ نشستوں پر انتخاب نہ ہو سکے۔(۲۱)

مذکورہ بالا متون میں جس مسئلے کو اجاگر کیا وہ مشرقی پاکستان کا وہ احساس تنہائی تھا جس نے بنگالی قومیت کو انتہا پسندی کی جانب مائل کر دیا اور مغربی پاکستان کے خلاف نفرت اور تعصب بڑھتا چلا گیا۔اس مسئلے کو صدیق سالک اور دوسرے مصنفین نے بھی اپنی کتب میں تحریر کیا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو پاکستان کی سیاسی قیادت سے امید تھی کہ اُن کے حق خود اداریت کو تسلیم کیا جائے گا لیکن الیکشن کی ناکامی اور ۱۹۶۵ء کی جنگ نے یہ احساس دلایا کہ پاکستان میں سیاسی ادارے ناکام ہو چکے ہیں۔انہی مسائل کو عوامی لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے اراکین نے عوامی سطح کے سیاسی اقتدار اعلیٰ کے سامنے پیش کیا۔جنرل صاحب نے بھی اس طرف اشارہ کیا کہ ایک طرف تو سیاسی اداروں کی ناکامی "سیاسی رہنماؤں کی شورشیں سیاسی مسائل کو بڑھا رہی تھیں۔وہیں ایوب خان جو اس وقت ملک کے سربراہ بھی تھے اور ملک کی جغرافیائی حدود کے ساتھ سیاسی حالات سے بھی واقفیت رکھتے تھے انہیں دونوں حصوں کو برابری اور تحفظ دینا چاہیے تھا اور فوج جو دونوں حصوں میں تحفظ کی علامت تھی وہ بھی ناکام ہو گئی۔کیونکہ فوج کے اصول وضوابط کے مطابق نچلے آفیسر نے اپنے سے بڑے آفیسر کے

احکامات کو مانا۔ جس نے مشرقی پاکستان میں غیر تحفظی کو بڑھا دیا پھر مرکزی حکومت اُن سوالات اور مشرقی پاکستان کی خواہشات کا صحیح طریقے سے مناسب حل نہیں نکال پائی۔ مرکزی اور صوبائی سطح پر حکمرانوں کے جو اختلافات تھے۔ انہیں صفدر محمود صاحب نے بہت تفصیل سے اور سیاسی رہنماؤں کے ناموں کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ ان مخالفتون کا نتیجہ یہ رہا کہ سیاسی مخالفین کو پروگینڈا کرنے کا موقع ملا۔ میجر صاحب نے غیر جانبدارانہ انداز میں افواج کے کردار پر بھی تبصرہ کیا۔ اُن کے اس تبصرہ سے افواج کی کمزوریاں بھی سامنے آتی ہیں کہ علیحدگی کی ذمہ داری کہیں نہ کہیں افواج پاکستان بھی رہی۔ جب کے صفدر صاحب کے خیال میں سیاسی انتشار ہی تمام اختلاف کی وجہ تھا۔

مشرقی پاکستان اور سیاسی انتشار

صفدر صاحب تحریر کرتے ہیں 'مشرقی پاکستان کی پالیسی مرتب کرنے والے پاکستان کے دوسرے علاقوں کے ملازمین تھے مرکزی حکومت نے عوام کو اعتماد میں لیے بغیر گورنر اور وزیر مقرر کر دیئے تھے۔ مشرق کے لوگ انہیں اپنا اصل نمائندہ نہیں سمجھتے تھے۔ دوسری جانب امریکی امداد کے نتیجے میں افراط زر ہو گیا جس سے ملک کی اقتصادیات کو نقصان پہنچا'(۲۲)

اقتباس دیگر میں صفدر صاحب تحریر کرتے ہیں:۔

'اس سیاسی موحول میں "مسلم لیگ" کے مقابلے میں جو اہمیت ملی "وہ کرشک سرامک، عوامی لیگ کو ملی عوامی لیگ، مولانا بھاشانی، حسین شہید سہروردی، کرشک سرامک کے لیڈر فضل الحق" تھے عوامی لیگ کیونکہ علاقائی سیاسی جماعت تھی اس لیے اسکا سیاسی منشور مقامی لوگوں کے لیے زیادہ پرکشش تھا اور اس میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔ اسوجہ سے اس کے حمایتی زیادہ ہو گئے اور یہ کمیونسٹ کی پسندیدہ جماعت تھی۔'(۲۳)

ان عبارات میں قلم کار نے دائیں، بائیں بازو کی سیاست کو واضح کیا ہے۔ کہ کیسے بائیں بازو کے سیاستدانوں نے موقعہ دیکھ کر فائدہ اٹھایا دوسرے اس سیاسی ریشہ دوانی کی وجہ سے مسلم لیگ غیر فعال ہو گئی۔ حالانکہ یہ وہ مسلم لیگ تھی جو کہ تمام مسلمانوں کے حقوق کی بات کرتی تھی لیکن آزادی کے بعد بھی مسلم لیگی رہنماء اپنے سیاسی پروگرام میں تبدیلی نہیں لے کر آئے اور ریاست میں رہنے والی اقلیتوں کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ اگر چہ سیاسی جماعتیں بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور عوامی رجحانات کے ساتھ اپنے سیاسی ایجنڈے کو تبدیل بھی کرتی ہیں۔ ان حالات میں عوامی لیگ جو تمام مشرق پاکستان کی نمائندگی کر رہی تھی مقبول ہو گئی۔ حالانکہ یہ مسلم لیگ کی غلط حکمت عملی تھی سیاسی جماعتیں اپنے وجود کی بقاء کے لیے وقت کی تبدیلی یا عوام الناس کے فکری زاویوں کے مختلف ہونے کی بناء پر اپنے سیاسی پروگرام کو تبدیل بھی کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "تاریخ" دائیں بائیں بازو کی سیاست سے منسلک ہو گئی۔ اور آج تک ہے۔ کیونکہ جب تاریخ یا مضامین بائیں

بازو کے حامی مصنفین تحریر کریں تو کسی حد تک جانبدار ہو جاتے ہیں۔اس سے ایک اور " نظریہ " تاریخ میں داخل ہوا کہ پاکستان کے صوبوں میں رہنے والے مذہب کی بجائے اپنے ثقافتی ورثے کی بناء پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اس کی ایک مثال تو یونینسٹ پارٹی کی ہے جب تک سر فضل حسین زندہ رہے مسلم لیگ پنجاب میں اپنے آپ کو فعال نہ کر سکی۔اسی ثقافتی انداز فکر کے بارے میں ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں" عوامی لیگ نے علاقائی خود مختاری کے تصور کو عوام کے تمام اقتصادی اور سیاسی مسائل کا حل بنا کر پیش کیا... گانا تنتری دل (سوشلیٹوں کی جماعت) اور طلباء نے سیاسی مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیا...اس بات سے اندازہ کیجیے کہ طلباء مشرقی پاکستان کی سیاست میں کس قدر فعال تھے"(۲۴)

ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں" ۱۹۵۴ء کے عام انتخابات میں انتخابی مہم کے درمیان میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے فرق کو واضح کیا گیا"(۲۵)

تاریخ کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار بنگالی قومیت کے حوالے سے طلباء کی سرگرمیوں کو ٹھہرایا ہے۔مگر مصنف یہ بھول گئے ہیں کہ مسلم لیگ بھی علیگڑھ کے طلباء کی شب و روز محنت کا شاخسانہ تھی اور اسی وجہ سے دیوبند نظریہ فکر کے لوگ اُسے علیگڑھ تحریک کہتے تھے۔'تاریخ' پر اس کے اثرات یہ بھی مرتب ہوئے کہ مشرقی پاکستان کی سیاست میں بنگالی اور غیر بنگالی اختلاف پیدا ہو گیا۔مسلم لیگ کیونکہ مسلمانوں کے حقوق پر کام کر رہی تھی جبکہ اُس کے برعکس باقی تنظیمیں معاشی ذرائع کو استعمال کر کے اقلیت و اکثریت کی حمایت حاصل کر رہی تھیں۔ اس صورت حال میں مفاد پرست لوگوں کو اپنے عزائم پورے کرنے کا بہترین موقعہ میسر آ گیا۔متون دیگر میں دوسرے مسائل کو اجاگر کیا گیا جو ۱۹۷۱ء کے سانحہ کا سبب بنے۔

۱۹۶۵ء کے بعد سیاسی فضاء اور سیاسی حلقوں کی بے چینی

دونوں ہی مصنفین نے ۱۹۶۵ء کے بعد کی سیاسی فضاء کو واضح کرنے کوشش کی ہے۔برسر اقتدار آنے کے بعد صدر ایوب نے جو اقدامات حکومتی ڈھانچے میں کیے اُس کی وجہ سے عوام کسی حد تک مطمئن ہو گئے لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد جب معاہدۂ تاشقند ہو گیا تو اس دوران حکومت پر تنقید شروع ہو گئی۔

ڈاکٹر صفدر کے مطابق 'نئی حکومت آنے کے بعد وقتی طور پر حالات معمول پر آ گئے لیکن جلد ہی یہ سیاسی اور اقتصادی حکمت عملی ناکام ہو گئی اور لوگ مشکلات کا شکار ہو گئے۔مشرقی پاکستان کے لوگوں میں " سیاسی محرومی " بڑھ گئی کیونکہ " اب ان پر ایسا مغربی پاکستان مسلط ہو گیا تھا جس کے اقتدار کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ افواج اور نوکر شاہی تھے " رفتہ رفتہ ایوب خان خوشامدی لوگوں میں گھر گئے۔کیونکہ اُن کا تعلق خود فوج سے تھا۔اس وجہ سے دونوں صوبوں میں مضبوطی سے حکومت چلانے کی کوشش کی'(۲۶)

عبارت دیگر میں جنرل فضل مقیم تحریر کرتے ہیں 'معاہدہ تاشقند "۳ جون ۱۹۶۶ء" کو دستخط ہوا "وزیر خارجہ "جناب ذوالفقار علی بھٹو نے "معاہدہ تاشقند" سے اختلاف کیا اور بھارت پر الزام لگایا کہ "مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک کو ہوا دے رہا ہے "اسی دوران اگرتلہ سازش بے نقاب ہوگئی اور شیخ مجیب کے ساتھ تقریباً (۳۵) پینتیس افراد گرفتار کیے گئے جس میں دوسرے فوجی اور شہری عہدے داران شامل تھے اسی اثناء میں کیپٹن معظّم کی ڈائری بھی پکڑی گئی۔جس میں ۱۹۷۱ء مارچ میں ہونے والے واقعہ کی تفصیلات بھی درج تھیں۔اسی دوران ایوب خان بیمار ہوگئے اور بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد اُنکی شہرت میں کمی آچکی تھی۔اس کے ساتھ ہی سیاسی معاملات میں اُن کا اثر ورسوخ کم ہوتا چلا گیا۔اور حکومت کے اراکین کا اعتماد بھی ختم ہونے لگا۔'(۲۷)

عبارات بالا سے جو مفہوم نکلتا ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر صفدر نے لفظ "طاقت'' کی بجائے "مضبوط "استعمال کیا تا کہ قاری پر حکومت کا اور ایوب خان کا مثبت اثر پڑے۔کیونکہ مصنف نے جس طرح سے دوسرے سیاستدانوں کو نام بہ نام تنقید و تعریف کا نشانہ بنایا ہے۔ویسی تنقید اُنہوں نے ایوب خان پر نہیں کی لکھتے ہیں "حقیقت پسندانہ جائزہ بتاتا ہے کہ صرف ایوب خان کی حکومت نے ملک کے دونوں حصوں کے مابین عدم مساوات کو دور کرنے کی کوشش کی "(۲۸) ڈاکٹر صاحب کا اپنا تعلق مغرب سے ہے اس وجہ سے صدر ایوب خان اور مغربی پاکستان کی قیادت کو وہ صحیح سمجھتے تھے۔جنرل مقیم اور ڈاکٹر صفدر نے مشترکہ نظریاتی رجحان کی بدولت ایوب خان کی حکومت کا دفاع کیا ہے۔اگر کسی جگہ پر ضرورت کے تحت ذکر کیا تو اتنے مدبرانہ سبھاؤ سے کہ جس کے منفی اثرات 'قاری' اور 'تاریخ' پر مرتب نہ ہوں۔اُس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جنرل صاحب خود تو افواج میں سے ہیں۔دوسری وجہ سیاسی دباؤ بھی معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ ایوب خان کی حکومت میں تشہیر ساز اداروں پر جو پابندیاں عائد تھیں اُس کے اثرات بھی 'تاریخ' پر پڑے بے شک کتب دوسرے مارشل عہد میں تصنیف ہوئیں لیکن اقتدار کا طرز تو "آمریت" ہی تھا۔اس کے ساتھ جنرل صاحب نے جتنی خوبصورتی سے عوام کے ذہنوں کو مغربی قیادت کی طرف سے موڑا نیز مشرقی پاکستان کی قیادت اور ہندوستان کے تعلق کو اٹھایا۔اس تحریری انداز کی وجہ سے مشرقی پاکستان کی قیادت کا عکس دھندلا گیا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسے ثبوت ملے تھے تو کارروائی کیوں نہیں کی گئی یا یہ بھی ایک سازش تھی۔مشرق پاکستان اور بحریہ کے خلاف۔دوسرے عوام کے ذہنوں کو تیار کرنا تھا کہ اقتدار صرف مغربی قیادت کے پاس ہونا چاہیے۔اسی میں ملک اور قوم کی بقاء ہے۔مشرقی قیادت کے پاس اقتدار کا جانا ملک کو ہندوستان کے حوالے کرنا تھا۔اس عہد کے دوسرے مآخذ میں کیپٹن معظم کو گرفتار کرنے کا حوالہ تو ملتا ہے لیکن ڈائری کا تذکرہ نہیں ملتا۔جبکہ اگر تلہ سازش کے بارے میں تو زیادہ تر مصنفین، قلم کار لکھتے ہیں لیکن کوئی بھی قلم کار ان حقائق کو اجاگر نہیں کرتا کہ سازش دراصل تھی کیا؟ اُس کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ جبکہ اس ضمن میں منیر احمد صاحب نے تحریر کیا "یہ سی آئی اے اور آئی ایس آئی کا مشترکہ پلان تھا کہ جس کے تحت مجیب کو گرفتار کیا گیا'' (۲۹) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حکومت عوام کے ذہنوں

سے شیخ مجیب کی کشش کو کم نہیں کر سکی تو اس نے ایجنسیوں کا سہارا لے کر شیخ مجیب کو بدنام کیا۔ایسے حالات میں ایک سوال یہ اُبھرتا ہے کہ دونوں ہی مصنفین نے چند لوگوں کو بچانے کی خاطر حقائق کو چھپالیا یا پھر فوری طور پر تحقیقات نہیں ہوسکیں اور جو معلومات میسر تھیں انہیں ہی قلم بند کر دیا گیا۔بحر حال تاریخ کے نقطہ نظر سے یہ عام بات تھی تاریخی حقائق کو چھپانا۔چونکہ اگر میجر جنرل کے بیان کو دیکھا جائے تو انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر برسبیل تذکرہ کیا ہے۔تاشقند معاہدے میں اور اس کے بعد ایوب خان کے دور میں بھٹو کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔سارا الزام ایوب خان اور اُن کی حکومت کو دیا جاتا ہے کہ وہ حالات کو نہیں سنبھال سکے اور اقتدار کو یحییٰ خان کے سپرد کر دیا۔

جو اقتدار کی منتقلی کا سبب بنے

داخلی شورش اور اقتدار کی منتقلی کے ضمن میں میجر صاحب نے تحریر کیا 'ان حالات کے تحت صدر ایوب نے سیاست دانوں کے ساتھ ایک کانفرنس کرنا چاہی اور حزب اختلاف کے رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی لیکن یہ ناکام ہوگئی کیونکہ مشرقی پاکستان کے چھ نکات مغربی پاکستان نے اور مغرب کی تجاویز مشرق نے ماننے سے انکار کر دیا۔ایوب خان نے شیخ مجیب کے دو نکات مانے ایک بالغ رائے دی اور دوسرا پارلیمانی طرز حکومت... لیکن یہ کانفرنس ناکام ہوگئی اور اس سیاسی چپقلش نے ملک کو ڈکٹیٹر شپ کی طرف دھکیل دیا۔صدر ایوب کی حکومت کے لیے یہ افسوس ناک بات ہے کہ وہ سیاسی قیادت جو انہیں برسر اقتدار لائی تھی اب وہ ہی ان کی تباہی میں مصروف عمل ہوگئی۔چنانچہ ۲۵/ مارچ ۱۹۶۹ء کو دوسرا مارشل لاء لگا اور اقتدار یحییٰ خان کے ہاتھوں میں آ گیا'(۳۰)

اس ضمن میں ڈاکٹر صفدر محمود اس طرح سے رقم طراز ہیں:۔

'مشرقی پاکستان میں جو سیاسی ابتری اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی ایوب خان اس سے کسی حد تک واقف تھے۔اس لیے انہوں نے دونوں صوبوں کے درمیان میں باہمی فضا بحال کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے۔جیسے دونوں صوبوں کے درمیان میں "طلبہ روابط"، "بین الصوبائی تعلقات"، "افسروں میں بین الصوبائی تقرریاں" اس طرح انہوں نے بین الصوبائی شادیوں پر بھی زور دیا۔لیکن یہ ثقافتی فرق ہونے کی وجہ سے اتنا کامیاب نہیں ہوسکا کیوں کہ ان کے تمام منصوبے ان کے ہی زیر اثر عملے نے ناکام کر دیئے۔وظائف دینے کا رواج بھی شروع ہوگیا۔"اور یہ زیادہ تر وزراء اور امراء کے بیٹوں کو دیئے گئے" ان کے ہی زمانے میں ملازمتیں کوٹے پر دینے کا رواج بھی شروع کیا گیا۔"وزارت دفاع کے بیان کے مطابق اگر چہ ایوب خان نے مشرقی پاکستان والوں کے لیے مسلح افواج میں داخلے کا جسمانی معیار بھی نرم کر دیا تھا۔"بنیادی جمہوریتوں کے نظام سے ایوب خان نے اپنے حمایتی تو پیدا کر لیے لیکن یہ وہ لوگ تھے جن کو عوام ناپسند کرتے تھے۔اس طرح انہوں نے آئین پر عوام کی رائے نہیں لی" شاید وہ عوام کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے" ۱۹۶۵ء میں ان کی

ناپسندیدگی فاطمہ جناح کے مقابلے میں انتخابات لڑنے کی وجہ سے بڑھ گئی۔اس دوران سی آئی اے کے ذریعے سے مشرقی پاکستان کے حالات کو خراب کیا گیا اور اعلان تاشقند سے پوری قوم "مایوس و رنجیدہ ہوگئی" چنانچہ شیخ مجیب نے ان حالات کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنا چھ نکاتی ایجنڈا استعمال کر کے بنگالی قومیت کا پرچار کیا'(۳۱)

ڈاکٹر صفدر محمود دیگرے لکھتے ہیں'ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ "خلاصہ کلام یہ چھ نکاتی پروگرام ہماری قومیت پر ضرب ہے" شروع میں تو شیخ مجیب نے اپنے لہجے کو نرم رکھا لیکن بعد میں انتہاء پسندی آتی چلی گئی کیونکہ شیخ مجیب ایسے سیاسی لیڈر تھے جنہیں جنگ ۱۹۶۵ء پر بالکل بھی اس بات کا افسوس نہیں تھا اور انہوں نے اس زمرے میں کوئی بیان ہندوستان کے خلاف نہیں دیا۔ایوب خان نے نجیب کے چھ نکات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور حالات بگڑتے چلے گئے۔'(۳۲)

ان اقتباسات کو باغور پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنرل صاحب نے بہت سی تبدیلوں کا ذکر نہیں کرتے ہوئے ثابت کیا کہ ایوب خان کو کیسے ناکام کیا گیا اور عنان حکومت کس طرح سے ایک دفعہ پھر " آمر" کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ یہاں ایک حاسدانہ رویئے کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔(شاید جنرل صاحب یحیٰی خان کو بذات خود پسند نہیں کرتے تھے) اس کے ساتھ ہی ایک لائن میں سیاسی فقدان کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔مصنفین کے بیانات کے مطابق ایوب خان کا خاکہ ایک اچھے حکمران کا ہے اور ان کے ہر ہر منصوبے کو سراہا ہے کہ انہوں نے مغربی پاکستان میں ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے اپنے لوگوں نے اُن کو ناکام کر دیا۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایوب خان کو حکومت اور اُس کے اداروں میں جو کچھ ہو رہا تھا کیا وہ معلوم نہیں تھا؟ کیونکہ یہ بات تو ثابت ہے کہ صدارتی نظام میں بننے والی ہر پالیسی اور ہر فیصلہ صدر کی مرضی کے بغیر نہیں کیا جاتا تو کیا صدر ایوب اتنے ہی ناواقف تھے جتنا مصنف نے انہیں دکھانے کی کوشش کی ہے۔(اچھا مذاق ہے) اس کے علاوہ اس متن میں جہاں تک عوامی رائے کی بات ہے تو مصنف نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ صدر ایوب نے اگر براہ راست عوام کے رائے نہیں لی تھی تب بھی بالواسطہ طریقے سے عوام کو شامل کیا گیا تھا۔یہ ایک الگ بات ہے کہ سیاسی جماعتیں اُن کے اس طریقہ کار سے متفق نہیں تھیں۔اس کے علاوہ ایک نکتہ فوجی معیار کو کم کرنے کا بھی سامنے آیا۔یہ نکتہ افواج کے نکتہ نظر سے تو بہت اہم نکتہ تھا۔ایوب خان کے عہد حکومت میں بھی اس میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا چونکہ زیادہ تر مصنفین کی تحریریں ثابت کرتی ہیں کہ تقسیم کے وقت سے ہی مشرقی پاکستان کے لوگوں کی نمائندگی افواج میں کم تھی۔اس کے علاوہ " بحریہ" اور فضائیہ" کی تنظیم کو بڑھانے کی جانب بھی کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی (حالانکہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم اتنا بڑا سمندر رکھتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی دوسرے حصے میں پہنچنے کے لیے فضائی حدود میں بھی مضبوطی ضروری تھی کوئی دوسرا راستہ بین الصوبائی تعلقات کے لیے موجود نہیں تھا۔ایسے میں ایک فوجی آفیسر کی حیثیت سے اور صدر پاکستان کی حیثیت سے صدر ایوب خان نے اس طرف سے پہلوتہی برتی تو اسے کیا کہا جائے) تاشقند معاہدے میں صدر ایوب نے قوم کو مایوس کر دیا لیکن راقم نے اس معاہدے کی دوسری اہم شخصیت ذوالفقار

علی بھٹو کا کہیں ذکر نہیں کیا۔اور یہ بھی نہیں بتایا کہ بھٹو صاحب نے پاکستانی وزیر خارجہ ہونے کی حیثیت سے دوران معاہدہ کیا کردار ادا کیا۔جبکہ یہ ایک اہم نکتہ تھا کیونکہ ایسے معاہدوں کی کامیابی اور ناکامی اہم اشخاص کے بیانات اور حکمت عملی پر مبنی ہوتی ہیں۔اس سے ہی مصنف کے فکری زاویوں سے آگاہی ہو جاتی ہے۔مورّخ نے صدر ایوب کا دفاع بہت خوبصورتی سے کیا ہے اور سارا الزام نچلے عملے پر ڈال دیا اور تاشقند معاہدے کی تفصیلات نہیں دے کر مکمل جانبدار ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے جبکہ دوسرے بازو کے سیاسی رہنما شیخ مجیب اور چھ نکات پر تبصرہ کیا کہ چھ نکات علیحدگی پسندانہ سوچ کے حامل تھے اور مشرقی پاکستان کے تمام تر حالات کی خرابی شیخ مجیب کے سیاسی ایجنڈے کی مرہون منت تھی اس لیے صدر ایوب نے انہیں اہمیت نہیں دی۔اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید تمام مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جو ملک کے سربراہان بھی رہے انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ عوامی حلقوں کی رائے کو اہمیت نہیں دینی ہے۔کیونکہ یہی ردعمل جنرل یحییٰ کے اور جنرل ضیاء الحق کے ادوار میں بھی نظر آتا ہے۔کیونکہ اس قسم کی تحریر سے جو پیغام قاری تک پہنچے گا وہ یہ کہ ہمارے صدر اور مغربی پاکستان کے لوگوں کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ صرف اور صرف بنگالی ہی ان مسائل کو ابھارنے کے ذمہ دار تھے۔

اقتدار کی منتقلی کے بعد یحییٰ خان کی حکمت عملی

مختصراً اقتدار تو مندرجہ بالا حالات کی اور عوامی حلقوں میں ایوب خان کی ناپسندیدگی کی وجہ سے یحییٰ خان کے ہاتھوں میں آ گیا۔یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالتے ہی ملک میں عام انتخابات کروانے کا فیصلہ کر دیا.اس ضمن میں بعد کے حالات پر مصنفین تحریر کرتے ہیں۔

میجر جنرل کے مطابق:۔'۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو مارشل لاء نافذ کیا گیا۔اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا قیام عمل میں آیا۔اپنے حمایتیوں کو جس میں میجر جنرل ایس۔جی۔ایم پیرزادہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت کے پرنسپل اسٹاف مقرر رہوئے۔اس سے ہیڈ کوارٹر کو سول حکومت کے تمام اختیارات سونپ دیئے گئے (بلواسطہ یہ پیغام عوامی حلقوں تک پہنچانے کی ضرورت سمجھی گئی اب سویلین (شہری عہدے داران) کے تمام اختیارات ہیڈ کوارٹر کے پاس تھے اور وہ براہ راست یحییٰ خان سے نہیں مل سکتے) وزارتوں کو چار بڑے حصول میں تقسیم کر دیا گیا۔"وزارت دفاع" وزارت امور داخلہ، وزارت سوشل معاملات، وزرات ترقی، وزرات دفاع کو براہ راست صدر مملکت کے اختیارات میں رکھا گیا۔اور باقی تین محکمہ جات کو ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، وزارت داخلہ، جنرل عبدالحمید خان (چیف آف آرمی اسٹاف) وزارت ترقی ایڈمرل ایس۔ایم۔احسن وزارت سوشل معاملات، ائیر مارشل نور خان کو دی گئیں۔انتظام کے لیے انتظامی کونسل کو ختم کر کے مرکز میں وزراء نامزد کیے گئے۔صوبائی نظم ونسق چلانے کے لیے،اس کے پیچھے یہ وجہ تھی کہ نور خان اور صدر مملکت کے درمیان میں تنازعات تھے جو اس وقت بڑھ گئے ایک مارشل لاء کو طول دینا چاہتا تھا جب کہ اس کے برعکس "بحریہ" کے ہیڈ ملک میں

جمہوری نظام قائم کر کے ایک لمبے عرصے تک بہتری چاہتے تھے۔احسن بھی فوری انتخابات کے حق میں تھے۔لیکن یحییٰ خان نہیں چاہتے تھے اس وجہ سے انہوں نے ایڈمرل احسن کو صوبہء مشرقی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔اور نور خان کو بھی گورنر شپ کے لیے ترغیب دی نور خان نے اس عہدے پر پانچ ماہ کام کیا۔آخر کار استعفیٰ پیش کر دیا'(۳۳)

عبارت دیگر میں میجر صاحب نے تحریر کیا۔'یحییٰ خان نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اپنے زیر اثر آفیسرز کو ایسے کاموں پر مامور کر دیا جو بالکل فروعی نوعیت کے تھے۔بہت زیادہ اہم نوعیت کے نہیں تھے۔اس طرح سے اس دہرے انتظامی نظام کی وجہ سے جو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں اور گورنروں کے درمیان تقسیم تھا۔مسائل اٹھے ۱۹۷۱ء کی کابینہ کی منسوخی کے بعد سکریٹریز کو صدر سے ملنے کی اجازت مل گئی اور اعلیٰ آفیسرز کی ایک کابینہ بن گئی۔یہ عملہ تمام اجلاس کا ایجنڈا طے کرنے پر معمور تھا۔اس نظام کا سب سے زیادہ نقصان "بحریہ" کو اٹھانا پڑا کیونکہ ایڈمرل مظفر حسن ایک شریف النفس انسان تھے ان کے اوصاف انہیں جنرل یحییٰ کا منظور نظر نہیں بنا سکتے تھے۔اور یہ بھی ممکنات میں نہیں تھا کہ وہ صدر صاحب کی رنگین محافل کا حصہ بن سکتے۔بہت سے اہم معاملات جنرل حمید اور صدر صاحب کے درمیان 'ساغر و مینا' کے عروج کے وقت زیر بحث آتے۔ان حالات میں ایسے آفیسرز جو اہم معاملات پر بات چیت کے خواہشمند ہوتے تھے اُن کی نظریں جنرل گل حسن کی طرف اٹھتی۔لیکن اُن کی رسائی بھی جنرل عبدالحمید تک نہیں تھی۔ایسی صورت حال میں عوام کا اعتماد فوج سے اٹھ گیا۔'(۳۴)

اقتباس دیگر میں صفدر محمود لکھتے ہیں' ملک میں ایک دفعہ پھر مارشل لاء کے نفاذ سے بے چینی پھیل گئی۔اور عوامی حلقوں میں یہ پیغام گیا کہ یہ جمہوریت کو کچلنے کا طریقہ ہے۔مشرقی پاکستان کے غیر بنگالی تو آرام سے ہو گئے لیکن بنگالی اور عوامی لیگ کے کارکن شدید مخالف ہوئے اس احساس نے وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے کو متحد کر دیا اور عوامی لیگ کو تحفظ دینے کی خاطر اٹھ کھڑے ہوئے (یہ تاریخ کا اہم موڑ ہے کہ انسانی استحصال کو پڑھا لکھا طبقہ سب سے پہلے محسوس کرتا ہے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان میں تعلیم کے فروغ پر توجہ نہیں دی جاتی کہ کہیں عوام پڑھ لکھ کر سوالات کرنے لگی تو حکمران طبقہ انہیں کیا جواب دے گا) اس مسئلہ کو لے کر بہت سے قلم کاروں ادباء کی سوچ ایک ہے۔بہر حال عوامی لیگ پڑھے لکھوں کی جماعت تھی مگر جب انتشار اور سیاسی ماحول بگڑ گیا تو اس میں ایسے افراد بھی شامل ہوئے جو فکر کے اعتبار سے جاہل تھے اور قوم پرستانہ اور انتہائی متعصب جذبات رکھتے تھے۔شروع میں تو یحییٰ خان اور شیخ مجیب کے درمیان میں دوستانہ تعلقات تھے اور جن اصولوں پر اتحاد ہوا تھا وہ ون یونٹ کا خاتمہ اور "ایک فرد ایک ووٹ" تھا۔اس رویئے نے مجیب کا حوصلہ بڑھا دیا اور وہ زخمی شیر کی مانند میدان سیاست میں کود پڑا۔" جنوری ۱۹۷۰ء میں تمام سرگرمیوں سے پابندی اٹھالی گئی۔اور LFO (لیگل فریم ورک) بنیادی اصولوں پر مبنی قانون کے تحت الیکشن ہوا'(۳۵)

متن دیگر میں ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں۔'شیخ مجیب نے چھ نکاتی پروگرام کے ذریعے انتخابات میں حصہ لیا۔اور

ظاہر یہ کیا کہ مشرقی پاکستان کے تمام سیاسی مسائل ان چھ نکات میں پوشیدہ ہیں۔جلسہء عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا" چھ نکاتی پروگرام پر عمل کیا جائے گا لیکن ملک پاکستان کی سالمیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا'' اور صوبائی خودمختاری کی ضمانت دی جائے گی۔اسی فیصلے کی بدولت انتخابات ہوئے جو کہ تشدد دباؤ اور جبر کی فضاء میں ہوئے'(۳۶)

سطورِ بالا میں دونوں ہی مصنفین نے دوسرے مارشل لاء اور یحییٰ خان کا اقتدار میں آنے کے بعد جو رویہ تھا اس پر تبصرہ کیا ہے۔جن کی بدولت کسی حد تک اُس وقت کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔میجر جنرل مقیم کیونکہ خود ایک ذمہ دار عہدے پر تھے۔دوسرے افوج سے تعلق رکھتے تھے۔اسوجہ سے جانتے تھے کہ ملکی سالمیت کے لیے عہدے اور ان کی تقسیم کس قدر اہمیت کی حامل تھی۔اسی لیے انھوں کے اُن عہدوں کی تفاصیل درج کیں۔جبکہ ڈاکٹر صفدر صاحب نے ان عہدوں اور عہدیداران کی جانب توجہ بھی نہیں دی بلکہ اپنی ساری توجہ صرف اور صرف سیاسی فضا اور سیاسی اداروں خاص کر سیاسی جماعتوں کی حکمت عملی کو بیان کرنے میں صرف کی۔شاہد اس کی وجہ اُن کی سیاسی ماحول سے قربت تھی جبکہ فضل صاحب کی سیاسی ماحول سے بہت زیادہ قربت نہیں تھی۔ان کے خیال میں عہدیداران کو جو اہم ذمہ داریاں تفویض ہونی چاہیے تھیں وہ نہیں دی گئیں خاص طور سے مشرقی پاکستان کے حوالے سے۔اگر چہ جو سیاسی فضا تھی اس میں ضروری تھا کہ افواج بہت اہم کام سرانجام دیتیں اس کے ساتھ ہی بین السطور سیاسی نشیب وفراز اور شیخ مجیب کے مشرقی پاکستان میں اثر ورسوخ پر روشنی بھی ڈالی ہے۔جن کی وجہ سے صدر صاحب نے ملک کی انتظامی معاملات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور خود اپنے حمایتیوں میں گھر گئے۔جبکہ حالات کی صورت حال یہ تھی کہ بین الصوبائی اور بین الاقوامی دونوں طرح کی سیاسی نزاکت کے تحت تمام اداروں کو کام کرنا چاہیے تھا ان اقتباسات میں ایک اور نکتہ میجر جنرل کے فکری زاویوں کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان کو افواج کا اس طرح سے ضائع کرنا پسند نہیں آیا تھا۔کیونکہ یہ بات تو انھوں نے اپنی تصنیف میں بار بار دہرائی ہے کہ سپاہی کا کام صرف داخلی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت ہوتا ہے۔ریاستوں کے نظام سنبھالنا نہیں لیکن ان کی تحریر کی ایک خوبی ہے کہ انہوں نے کھلے عام اور بے محابانہ تنقید سے گریز کیا ہے جو "تاریخ" کے نقطہ نظر سے بہت اہم ہے۔

جنرل مقیم اور ڈاکٹر صفدر کے اندازِ تحریر میں یہ فرق پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر صفدر نے عبارت بالا میں اس وقت پیش آنے والے سیاسی حالات اور اس دوران شیخ مجیب کی شخصیت کے حوالے سے بھرپور جذباتیت سے کام لیا ہے وہ اوپر ایک لفظ "زخمی شیر'' استعمال کرتے ہیں۔اسی طرح سے راقم نے اپنی تالیف میں جگہ جگہ بہت سے ایسے جذباتی جملوں کو استعمال کیا ہے۔اس کا اثر "تاریخ'' پر یہ ہوا کہ ابھی بھی قدیم دور سے لے کر حال تک ایسی رومانوی انداز میں لکھی گئی تحریریں قاری کے لیے اہم اور دلچسپی کا باعث ہیں۔جبکہ تاریخی حقائق پر مشتمل اور سیدھے سادے انداز میں لکھی گئی کتب خشک اور غیر اہم ثابت ہوتی ہیں۔بلکہ عام قاری تو ان معلومات پر بھی شک کرتا ہے اُس کے برعکس وہ کتب جن میں الفاظوں کی مدد سے بھرپور جذباتیت اور منظر نگاری کی جائے وہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔اُس کے اثرات "تاریخ نویسی" پر ایسے نظر آتے ہیں کہ

بیشتر مصنفین اپنی مرضی کا ماحول تخلیق کر کے عوام کے ذہنوں کو اُس میں قید کر دیتے ہیں اس رجحان کی وجہ سے صحافت کی وہ فکری جہتیں معاشرہ میں اُجاگر نہیں ہو رہی ہیں جو مستحکم اور تہذیب یافتہ معاشروں کی علامت ہوتی ہیں۔ جس میں اختلافات کو سننے اور سچائی کا سامنا کرنے کا ظرف پایا جاتا ہے۔ متون بالا سے تیسرا نکتہ "تاریخ" کے حوالے سے یہ سامنے آیا ہے کہ ہماری سیاسی طاقتیں آج اکسیویں صدی میں بھی مضبوط مرکز نہیں چاہتی اور صوبائی خودمختاری کو اہمیت دیتی ہیں۔

انتخابات۔دونوں طرف کی سیاسی فضا

یحییٰ خان نے اقتدار میں آنے کے بعد انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا اور اس پروگرام کے ذریعے سے ملک کے دونوں بازوؤں کی سیاسی جماعتوں نے انتخابات میں حصہ لیا۔

اس حوالے سے میجر جنرل تحریر کرتے ہیں،'انتخابات کے نتائج کی صورت میں مشرق میں عوامی لیگ اور مغرب میں پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئیں۔ البتہ ان میں سے کوئی بھی سیاسی جماعت دوسرے حصے میں نمائندہ ثابت نہ ہوسکی لیکن انتخابات کے نتائج کے بعد مشرقی پاکستان میں امن ہوگیا اور لوگ آپس میں اسی طرح سے مل جل کر رہنے لگے۔ دونوں فریقین مطمئن تھے کہ اب ملک میں قانون سازی کا عمل عوام کی سوچ کے مطابق ہوگا۔'(۳۷)

ان حالات پر ڈاکٹر صفدر محمود کچھ اس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں،'دسمبر ۱۹۷۰ء میں انتخابات ہوئے۔ عوامی لیگ نے قومی اسمبلی کی ۳۱۳ نشستوں میں سے ۱۶۷ اور پیپلز پارٹی ۸۸ نشستیں حاصل کیں عوامی لیگ انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد سخت اور غیر لچکدار ہوگئی۔ اور یحییٰ خان نے اُن کی کامیابی کا اعتراف کیا یہ کہہ کر" شیخ صاحب آئندہ کے وزیراعظم ہونگے" شیخ مجیب نے مغربی پاکستان آنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ صدر خود ڈھاکا آجائیں۔ "انہوں نے ڈھاکا میں اپنا ڈیرا جما لیا" مجیب کے اس رویئے کی وجہ سے وہ لوگ جو ملک کی سالمیت کے حمایتی تھے وہ مایوس ہوگئے۔ اس دوران عوامی لیگ کے ہائی کمان نے آئینی مسودہ تیار کر لیا اور ڈرا دھمکا کر منظور کروانے کی پالیسی پر عمل کیا گیا۔ اس دوران پیپلز پارٹی کا موقف یہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان کی نمائندہ ہے۔ اس وجہ سے اسے حکومت میں حصہ ملنا چاہیے تھا۔ جبکہ عوامی لیگ اس کے خلاف تھی پیپلز پارٹی کا یہ دعویٰ تھا کہ شیخ مجیب حکومت بنانے کے بعد اپنی مرضی کر کے گا اور ایسا کوئی آئین منظور نہیں ہوسکتا جو پاکستان کے دونوں حصوں کے نمائندہ گان کی مرضی کا نہ ہو۔'(۳۸)

مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہے کہ انتخابات کو دونوں ہی مصنفین نے اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے لیکن انتخابات کے نتائج کی صورت میں سیاسی حالات کے اُلجھاؤ کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے میجر جنرل مقیم کے مطابق کیونکہ انتخابات مشرقی پاکستان کے حق میں تھے۔ اس وجہ سے وہاں کے لوگوں کو اب اطمینان تھا کہ اب اُن کے آئینی وسیاسی حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ میجر جنرل فضل مقیم کی دی گئی معلومات اُس وقت کے دوسرے مآخذ سے بھی ثابت ہے۔ جن میں بریگیڈیر

صدیق سالک۔ڈاکٹر احمد سلیم۔اور جلیس سلال شامل ہیں۔اس کے برعکس صفدر صاحب کی اطلاعات بالکل ہی متضاد ہیں۔کیونکہ اُن کے مطابق انتخابات کے بعد عوامی لیگ کے لہجے میں لچک ختم ہوگئی۔اور مذکورہ بالا متون کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے مصنف کی ساری ہمدردی مغربی پاکستان سے ہے اس وجہ سے ان کا لہجہ کسی حد تک جانبدارانہ رویئے کا اظہار کرتا ہے۔جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے چند ایک حقائق کو تحریر کے پیچھے چھپا دیا ہے جہاں تک عام قاری کے فہم کا پہنچ جانا مشکل ہے۔

۱۹۷۱ء اور فوجی کاروائی

مشرقی پاکستان کے حالات انتخاب کے بعد دن بدن بگڑتے چلے گئے اور جب حالات حکومت کی گرفت سے باہر ہو گئے تو یحییٰ خان نے طاقت کا استعمال کیا۔

اس بارے میں میجر جنرل فضل تحریر کرتے ہیں،'اجلاس نہ ہونے کے سبب مشرقی پاکستان کے حالات دوبارہ خراب ہوگئے۔بار بار یحییٰ خان کو حالات سے باخبر کیا لیکن انہوں نے کوئی "نوٹس" نہیں لیا۔اس نتیجے میں مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی کی جانب سے "ایک دفعہ پھر جلاؤ گھیراؤ اور آزاد بنگلہ دیش کے نعرے لگائے گئے۔" ان حالات میں ایڈمرل احسن جو سابقہ گورنر تھے اور جنرل یعقوب جو موجودہ گورنر تھے اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (مشرق پاکستان) بھی نے حالات پر قابو پانا چاہا لیکن ناکام ہوگے۔ایسے میں میجر جنرل فرمان علی کو جی۔ایچ۔کیو بھیجا گیا تاکہ صدر سے مل کر حالات پر قابو پایا جائے۔اسی دوران جنرل یعقوب نے بھی استعفیٰ دیدیا۔جنرل یحییٰ خان غصے میں آ گئے اور جنرل ٹکا خان کو نیا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور گورنر بنا کر بھیجا گیا۔فوج کے ذریعے حالات کو قابو کیا گیا جنرل ٹکہ خان بھی حالات دیکھ کر پریشان ہوئے مگر حالات کو قابو میں کرنے کے لیے اقدامات کرنے لگے جس کے نتیجے میں عوامی لیگ اور افواج میں کافی جھڑپیں ہوئیں۔'(۳۹)

ڈاکٹر صفدر محمود کے مطابق،'دونوں جماعتوں کے موقف میں بہت فرق تھا۔اس سیاسی تعطل میں دونوں صوبوں کے حالات کشیدہ ہوگئے اور اجلاس غیر محدود مدت تک کے لیے ملتوی ہوگیا۔جس کا خیر مقدم پیپلز پارٹی نے خوش دلی سے کیا۔لیکن عوامی لیگ کا کہنا تھا کہ "یحییٰ خان کا یہ اقدام مسٹر بھٹو کے ساتھ مل کر عوامی امنگوں کو پامال کرنے کا ہے"،حالات کو قابو کرنے کے لیے جنرل ٹکہ خان کو گورنر بنایا گیا جب حالات خراب ہوئے تو فوجی آپریشن ہوا کیوں کہ مجیب نے پورے صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔چنانچہ ملک کو بچانے کے لیے فوجی کاروائی کا حکم دے دیا'(۴۰)

اس ضمن میں منیر احمد نے تحریر کیا۔(یہ وہ انٹرویو تھا جو یحییٰ خان نے حمود الرحمٰن کو دیا تھا۔)'یحییٰ خان ملک کے صدر نہیں رہنا چاہتے تھے۔اور انہوں نے بھٹو کے اس جملے پر "جو ڈھاکا جائے گا اُس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی اور اُسے واپسی کا

ٹکٹ نہیں دیا جائے گا۔اس پر تنبیہ کی تو انہوں نے کہا کہ ہم سیاسی لوگ ایسی حرکات کرتے رہتے ہیں"۔"اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ مجیب جھوٹا تھا تو مسٹر بھٹو چالاک اور مکروہ شکل مینڈک تھا" مسٹر بھٹو نے دو وزیر اعظم کا نظریہ پیش کیا بلکہ حکومت کے لیے "اِدھر ہم اُدھر تم" کا نعرہ لگایا۔انہوں نے مجھے بتایا کہ "بنگالی بہت غم و غصے کا شکار ہیں اجلاس کی تاریخ کا اعلان کیجیے میں ڈھاکا گیا اور جب مسٹر بھٹو کو بلایا تو وہ نہیں آئے "اور جب یحییٰ خان کے کہنے پر زبردستی گئے تو اخباری بیان میں شیخ مجیب پر " کیچڑ" اچھالتے رہے بلآخر حالات خراب ہوگئے۔اور حالات کو قابو کرنے کے لیے فوج طلب کرنی پڑی'(۴۱)

متون بالا کی عبارات کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مصنفین نے سیاسی دباؤ یا پھر ذاتی تعصب کی بناء پر کتب تحریر کیں۔لیکن یہ مصنفین کی کوئی مجبوری بھی ہوسکتی ہے کیونکہ فضل مقیم ایک فوجی تھے اسوجہ سے انہوں نے اپنی افواج کی کچھ کمزوریوں سے پردہ ہٹادیا۔اس کے ساتھ ہی یہ بتایا کہ صدر یحییٰ اور ہندوستان کی وجہ سے علیحدگی ہوئی۔کیونکہ ہندوستان نے اُن ہندو رہائشیوں کا فائدہ اٹھایا جو مشرق پاکستان میں بسے ہوئے تھے۔اُس کے برعکس ڈاکٹر صفدر محمود کے مطابق سارا قصور مشرقی پاکستان کا اور ابتدائی ادوار کی سیاسی شخصیات کا تھا۔جنھوں نے مل کر پاکستان علیحدہ کر دیا۔ان عبارات کی روشنی میں جو مشترک معلومات نظر آتی ہے وہ فوجی کارروائی کا ہونا ہے۔بلاشبہ فوجی کارروائی کرنے کی وجوہات دونوں کی نظر میں مختلف تھیں۔ایک جنرل ہونے کے باوجود فضل مقیم کے خیال میں فوجی کاروائی غلط تھی کیونکہ سیاسی مسائل کا حل سیاسی تصفیہ میں چھپا ہوتا ہے۔جب کہ ڈاکٹر صاحب کے مطابق شیخ مجیب اور عوامی لیگ کو دبانے کے لیے فوجی کاروائی صحیح تھی۔اس کا "تاریخ" پر یہ اثر ہوا کہ ہر فوجی حکومت میں تمام فوجی آفیسرز یہی کہتے ہیں کہ ہمارا کام سرحدوں کی حفاظت ہے۔لیکن اس کے باوجود شہروں کے اندر دخل اندازی سے باز بھی نہیں آتے ہیں۔اگرچہ اسی دوران چند افراد نے حالات کو سنبھالنے کے لیے کوشش کی۔جناب ایم۔اے مالک نے یحییٰ خان کو خط بھیجا" ہمیں ٹھنڈے دل سے اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیئے کہ کسی قسم کی فوجی کاروائی خواہ وہ کتنی ہی دانشمندانہ کیوں نہ ہو۔ملک کے دونوں بازوؤں کو امن وسکون سے متحد اور ہم آہنگ نہیں رکھ سکتی۔باوجود ان واقعات کے جو حال میں ہوئے ہم اب بھی ایک قوم رہ سکتے ہیں"(۴۲) یہ بالکل صحیح ہے کہ حالات واقعی میں بہت خراب تھے مگر اگر یحییٰ خان اور دوسرے سیاسی قائدین سنجیدگی سے اب بھی حالات کو قابو میں کرنا چاہتے تو مشرقی اور مغربی پاکستان میں یکجہتی ہوسکتی تھی۔بلآخر اندرونی خانہ جنگی اور خارجی عناصر کی سازشوں نے ملک کو جنگ کی طرف دھکیل دیا۔اس جنگ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان الگ ہوگیا اور نئی ریاست بنگلہ دیش کے نام سے معرض وجود میں آئی پاکستان کے (۹۰) نوّے ہزار فوجیوں نے ہندوستانی افواج کے سامنے ہتھیار ڈالے۔قومی سطح پر یہ شکست عوامی وسیاسی تمام حلقوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔

اس بدترین شکست کے بعد عوامی، سیاسی، ادبی اور سماجی حلقوں میں کئی سوال جنم لینے لگے۔یہ علیحدگی کیسے ہوئی؟ یہ

علیحدگی کیوں ہوئی؟ اس علیحدگی کا ذمہ دار کون ہے؟ چونکہ جیسے ہی مشرقی پاکستان میں افواج کے ہتھیار ڈالنے کی خبر کا مغربی پاکستان کے تشہیر ساز اداروں کی جانب سے اعلان کیا گیا عوام بپھر گئے اور انہوں نے یحییٰ خان سے زبردستی استعفیٰ لے لیا اور مغربی پاکستان کی باگ ڈور ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے حالات کو سنبھالنے اور عوامی سیاسی حلقوں کو قابو میں کرنے کے لیے حمود الرحمان کمیشن تشکیل دیا۔ اسی طرح سے عوامی اور سیاسی حلقوں کے نمائندوں نے بھی اپنے اپنے طرز سے تحقیق کی اور ان سوالات کے جوابات ڈھونڈے۔ اس تحقیق میں کچھ مصنفین کے جوابات اور متون کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ایڈمرل مظفر حسن کے بیان کے مطابق

"جرنل یحییٰ میں بہت زیادہ خامیاں تھیں لیکن ان میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ ایک کمانڈر ہونے کے ناتے ایک فوجی اپنے ماتحتوں پر پورا بھروسہ کرتا ہے" چنانچہ جنرل حمید "ائیر مارشل رحیم اور مجھ پر پورا بھروسہ کرتے تھے"... جنگ شروع ہی نہ ہوتی اگر ذوالفقار علی بھٹو اور ائیر مارشل رحیم غلط مشورے جنرل یحییٰ کو نہ دیتے۔ سبز باغ دکھا کر اس جنگ کے فیصلے پر آمادہ نہ کرتے... جنرل یحییٰ کو یہ باور کروایا کہ امریکہ کا ساتواں بیڑا فوجی مداخلت کے لیے آ رہا ہے۔"(۴۳)

جنرل ٹکہ خان کے بیان کے مطابق۔ "سانحہ مشرقی پاکستان کی ذمہ داری جنرل یحییٰ، شیخ مجیب، اے۔ کے۔ نیازی اور ذوالفقار علی بھٹو پر عائد ہوتی ہے"(۴۴)

میجر جنرل غلام عمر کے بیان کے مطابق۔ "سقوط مشرقی پاکستان کے ساتھ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو نے جبری ریٹائیرمنٹ دلوا کر زندان میں قید کر دیا"(۴۵)

ایڈمرل احسن کے بیان کے مطابق۔ "حقیقت میں آنکھیں رکھنے والے کے لیے یہ دیکھنا آسان ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اس سلسلے کے آخری بنگالی تھے جن کے ساتھ مغربی پاکستان بات کر سکتا تھا"(۴۶)

پروفیسر غفور احمد کے مطابق۔ "پولینڈ کی قرار دار چاک کرنے والی جماعت نے سرکاری طور پر "بنگلہ دیش" کی مہم چلائی اور اس سے اختلاف کرنے والوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا"(۴۷)

تجمل حسین کے بیان کے مطابق۔ "درحقیقت بہت سے سینئر جنرل بھی پاکستان توڑنے کے اتنے ہی ذمہ دار تھے جتنے کہ یحییٰ خان۔ زیڈ اے بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی اکثر کو ریٹائر کر دیا حالانکہ ان پر غداری کا مقدمہ چلنا چاہیئے تھا"(۴۸)

"حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا مقصد واقعہ کے ذمہ دار کا تعین تھا۔ یہ غلط خیال ہے بلکہ اس کا مقصد ایسے افراد جو اس واقعہ کے ذمہ دار تھے ان کو عدالتی تحقیقات کی مہر ثبت کر کے تحفظ دیا جا سکے"(۴۹)

بالائی امثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعہ کوئی بھی ہو کسی بھی نوعیت کا ہو اس کا ذمہ دار کبھی کوئی ایک فرد، ادارہ یا سماجی

حلقے نہیں ہوتے بلکہ اندرونی عوامل کے ساتھ بیرونی عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔اگر اُن پر دانشمندانہ طریقے سے قابو پالیا جائے تو یہ بیرونی عوامل اپنی کارکردگی بحال نہیں رکھ پاتے اور اندرونی اتحاد کی فضا کے باعث آپ ہی دم توڑ دیتے ہیں نیز دوسری صورت میں انہیں پھلنے اور پھولنے کا موقعہ ملتا ہے۔ یہ اندرونی مسائل کو پھیلاتے اور شورشیں برپا کر دیتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ایسے حادثات پیش آتے ہیں جو اقوام کی تاریخ میں باعث شرمندگی ہوتے ہیں۔کیونکہ منیر احمد نے جنرل یحییٰ کے بیٹے سے جو ملاقات کی اس میں انھوں نے یہ بتایا کہ اگر کوئی حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ پڑھے تو اُسے (راولپنڈی) جی۔ایچ۔ کیو کی آفتاب خان کمیٹی رپورٹ بھی ضرور زیر مطالعہ لانی چاہیے۔تب ہی اصل حقائق سے آگہی ممکن ہے اس بات کا اعتراف تو برگیڈیر صدیق سالک، میجر جنرل فرحان علی، نوابزادہ شیر علی خان پاٹودی نے بھی کیا ہے کہ اصل حقائق تک دونوں کمیٹی کی رپورٹ کو سامنے رکھ کر ہی پہنچا جا سکتا ہے۔

بہر حال دونوں ہی مصنفین نے اپنا اپنا نکتہ فکر اچھے انداز میں واضح کیا ہے۔میجر جنرل فضل مقیم نے وہ تمام کمزوریاں جو افواج اور اقتدار اعلیٰ اور دونوں بازوؤں کی کسی حد تک سیاسی قیادت میں تھیں بتائیں ہیں۔سوائے ذوالفقار علی بھٹو کے تقریباً سب کی نشاندہی کی ہے۔حتیٰ کہ اُس ساز و سامان اور تکنیکی صلاحیتوں کی بھی جو افواج کے پاس تھیں لکھتے ہیں "دوبارہ مشرقی پاکستان کو جو افواج کمک کے طور پر بھیجی گئیں وہ" جھولے پٹھولے" (کھیل کھلونے) لے کر آئی تھیں،(۵۰) اور یہ بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ملٹری کے دو، تین آفیسرز کے خراب ہو جانے سے ساری فوج غدار نہیں ہو جاتی۔ مصنف نے اپنی تحریر کو غیر جانبدارانہ بھی رکھا ہے۔ان رضا کاران دستوں کی صلاحیتوں، خدمات اور حب الوطنی کے جذبے کو سراہا ہے جو "البدر اور الشمس" کے نام سے مشہور تھے۔ان میں بنگالی وغیر بنگالی دونوں شامل تھے۔اداروں کی مضبوطی ان کے آفیسرز سے ہوتی ہے اور نچلہ عملہ بھی اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے کہ ان کے انجام دیئے گئے کارناموں اور خدمات پر ان سے بڑے آفیسرز ان کی حوصلہ افزائی کریں۔مگر کچھ حقائق پر پردہ بھی ڈالا ہے شاید اسکی وجہ خود اُسی ادارے سے وابسطہ ہونا ہے۔ بحرحال ایسی تلخ حقیقتوں کے سبب اپنا قومی تشخص اور وقار مجروع ہوتا ہے۔مثلاً افواج کے کردار پر مصنف کا خیال یہ ہے کہ افواج کا کردار مشرقی پاکستان میں بالکل وہ نہیں رہا جیسا بین الاقوامی خبر ساز ایجنسیوں اور بھارتی تشہیر ساز اداروں نے بتایا اس ضمن میں ہماری افواج سے غلطی یہ ہوئی کہ اُنہوں نے اپنی تمام خبر رساں ایجنسیز کو اور تشہیری اداروں کو آپریشن سے قبل علاقوں سے نکال دیا تھا۔اس طرح پاکستانی افواج کو بدنام کیا گیا۔اُن تمام ممالک کے تشہیری اداروں نے جن کے مفادات ایک تھے۔

ڈاکٹر صفدر محمود نے بھی اپنے نقطۂ فکر کی وضاحت کی کہ جنرل یحییٰ اور دوسرے چند بری، بحری، فضائی افواج سے تعلق رکھنے والے آفیسرز کی بدولت پوری افواج پاکستان کو غلط کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی شیخ مجیب الرّحمان جیسے کرداروں کی وجہ سے تمام سیاستدان غلط ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا ملک انہی لوگوں کی خدمت کی وجہ سے بچا ہوا ہے۔

اس تحقیق کے اثرات تاریخ نویسی پر اس طرح اثر انداز ہوئے کہ جو تاریخی کتب افواج پاکستان میں سے کسی بھی شخص نے تحریر کیں۔ اس میں کسی بھی سیاستدان اور آفیسرز کا نام لے کر تضحیک نہیں کی گئی اگر ذکر کیا گیا تو اُن کے عہدے کے ساتھ تا کہ پڑھنے والے کو اُس کے اختیارات کا اندازہ ہو جائے۔ سیاسی کارکنان اور قیادت کا ذکر بھی احترام سے کیا گیا۔ اور سیاسی اہمیت کو بھی واضح کیا۔ اس طرح کا تحریری انداز مصنف کو جانبداری اور جذباتیت سے بچاتا ہے دوسری جانب قاری کو بھی ڈرامائی حالت میں نہیں لے جاتا۔ جس کی بدولت وہ اصل حقائق تک با آسانی پہنچ سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملکی وقار اور سالمیت کی خاطر کچھ باتیں اور دستاویزات خفیہ بھی رکھنی ضروری ہیں ورنہ عوام کا اعتماد اپنے ہی اداروں سے اٹھ جائے جیسے آج کل جو ہمارے برقی ذرائع ابلاغ کا کردار ہے۔ جس کی وجہ سے عوام اس قدر شکی ہوگئی ہے کہ اُن کی نظر میں کوئی بھی اور کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔

اس تحقیق کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ اس دور میں جو تاریخ لکھی گئی اس میں پچھلی حکومت کی برائیاں اور موجودہ حکومت کی غیر ضروری تعریف بیان کی گئی اور یہ رویہ آج تک موجود ہے اس کے علاوہ ایسی کتب اور تحریروں کی اشاعت اور چھپائی جرم بن گئی جو اُن اصولوں کی پابندی نہیں کر سکیں جو ان ادوار میں ادارہ نشریات و اطلاعات کی جانب سے وضع کیے گئے تھے۔ ایسے مصنفین نے سچ کو لکھنے اور کہنے کا انتظار کیا۔ اُس وقت تک جب تک اُن کی تحریروں کے لیے سیاسی فضاء سازگار نہ ہوگئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم آج بھی اپنے رویوں میں باشعور نہیں ہیں۔

تاریخ کے نقطہء نظر سے عساکر کی تاریخ نے جو رجحان قائم کیا وہ عساکر کا جغرافیائی حدود سے ناواقفیت ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر افواج جغرافیہ سے واقف نہیں تھیں تو لڑنے کیوں گئیں۔ کیا یہ بھی نفسیاتی طرزِ عمل ہے کہ اگر شکست ہو جائے تو بجائے اپنی غلطی ماننے کے تمام الزام جغرافیائی حدود در بعہ کو دیدیا جائے۔ ہماری تاریخ آج بھی ایسے ہی رقم کی جاتی ہے۔ بلکہ ڈرامائی طرز بیان لانے کے لیے ایسے حصوں کو نمائیاں جگہ دی جاتی ہے۔ خاص کر وہ تاریخ جو صرف فوجی جھڑپوں پر تحریر کی جائیے۔ اگر چہ جب ۱۹۶۵ء میں اندازہ ہو چکا تھا کہ پاک فوج گوریلا جنگ کی تکنیک نہیں جانتی ہے تو دوسری مرتبہ ۱۹۷۱ء میں پھر مشرقی پاکستان کے جغرافیہ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ بڑے بڑے تمام آفیسرز یہ ہی شکایت کرتے ہوئے پائے گئے کہ ہم نے مسلسل یحییٰ خان کو اطلاع دی کہ ہم گوریلا جنگ لڑنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ حالانکہ صفدر محمود صاحب نے ایک جگہ تحریر کیا کہ "ہمارا ایک فوجی مشرقی پاکستان کے مکی باہنی کے بیس (۲۰) افراد کے برابر تھا" اس طرح کی تحریر پر حقیقت کا نہیں افسانے کا گمان ہوتا ہے۔ دوسرے اس طرح کی تحاریر کو ثابت کرنے کے لیے مسلمان مصنفین کے پاس تو اسلام کا ایک نظریہ جہاد موجود ہے۔ جن سے جنگ تھی اُنھیں اپنانے کے لیے اب ہم تیار نہیں تھے وہ ہمارے لیے ہندو تھے۔ تو اس صورت حال میں اس نظریہ کو استعمال کر کے اگر مصنف پچاس (۵۰) کے برابر بھی لکھ دیتے تو عام قاری کو کوئی فرق نہیں پڑھتا مگر تاریخ کا طالب علم اصل حقیقت کو جاننے سے کسی حد تک محروم رہ جاتا اور فکر کی گہرائیوں میں اتر جاتا

ہے۔دور چاہے عسکری ہو یا آمریت سے بھرپور ہر دو صورتوں میں بحر حال" قاری" کو مبالغہ آمیزی کا بھرپور موقعہ دیا ہے۔

اس تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد میں جنگ کے حالات کے بارے میں غلط بیانی کا عمل غالب آیا۔ جب بھی جنگ کے دوران حالات خراب ہوئے تو لوگوں کو اصل حقائق نہیں بتائے گئے بلکہ سارا کا سارا الزام ہائی کمان کو دیدیا گیا یا دوسرا نکتہ یہ تھا کہ حالات کی وجہ سے ہائی کمان کے حوصلے جواب دے چکے تھے اور شکست کے اصل ذمہ دار یہ ہی لوگ تھے۔ یہ زاویہ ایوب خان کے دور میں لکھی جانے والی کتب میں بھی پایا جاتا ہے اور یحیٰی خان کے عہد میں تو بیشتر کتب کا موضوع ہے۔لیکن مکمل طور سے ایسی صورت حال نہیں ہے۔ چند ایک ملٹری آفیسرز نے صحیح حالات کی نشاندہی کی ہے یہ الگ بات ہے کہ مشیران خاص کی جانب سے ہائی کمان کو بے خبر رکھا گیا۔جنگوں کے حالات پر مشتمل کتب آج بھی انہی اثرات سے متاثر ہوکر لکھی جاتی ہیں۔ جیسے ماضی بعید میں تحریر کی جاتی تھیں اُس کی وجہ نظریات کا مشترک ہونا ہے۔

واقعہ چاہے کسی ہی نوعیت کا ہو آمریت کے عہد میں لکھی جانے والی تاریخ سے ایک اہم پہلو یہ سامنے آیا کہ تحریر کسی آفیسر کی ہو یا کسی ادیب کی مارشل نسلیں اپنے تعلقات مارشل نسلوں سے ہی رکھنا اور جوڑنا پسند کرتی ہیں۔ اور ان کی کامیابیوں اور کارناموں کی مدد سے حال کی تاریخ کو رقم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایوب خان کے دور میں لکھی جانے اور لکھوائی جانے والی تصانیف میں سکندر اعظم ۔ہٹلر، لوئی چہاردھم، ہنری چہارم، محمد بن قاسم اور محمود غزنوی جیسے فاتح بنیادی کردار ہیں اور ان کی جنگی حکمت عملی اور اس کو فتح کرنے کے لیے جو مشترک اقوال استعمال کیے جاتے تھے وہ کتب کا بنیادی حصہ ہیں۔ ہم نے تاریخ کو براہ راست عرب سے شروع کیا ہے ان میں جو مارشل کردار نظر آتے ہیں ان میں خالد بن ولید، محمد بن قاسم اور دیگرے شامل ہیں۔

اس تحقیق کے ذریعے یہ بھی ثابت ہوا جنگجو نسلیں ہمیشہ اپنے ماضی پر بڑا فخر کرتی ہیں اور ہر موجودہ نسل اپنی اگلی نسل کو پچھلی نسل کے واقعات، بہادری کے قصے، شجرہ انساب کی اہمیت سنا کر لڑنے کے جذبے کو زندہ رکھتی ہے پاکستان میں لکھی جانے والی " تاریخ" ان ہی اثرات سے مزین ہے۔ چونکہ ایسے تمام مصنفین اور مورخین کے نزدیک بہادری، دلیری اور شجاعت موروثی ہوتے ہیں۔ مثلاً صفدر محمود صاحب نے بارہا اپنی تصنیف میں ذکر کیا ہماری قیادت میں کوئی محمد بن قاسم ہونا چاہیے تو کوئی شہاب الدین غوری۔

مذکورہ بالا تحقیق کا حاصل یہ ہے سن ۱۹۷۱ء کے واقعہ سے پہلے اور بعد میں مارشل لاء عہد کی خرابیوں پر پردہ ڈالنے اور اسے فعال اور عوام میں مقبول بنانے کے لیے ریاستی مشینری کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا گیا۔ جیسے ایوب خان اور پھر یحیٰی خان نے ریڈیو، اخبارات کو استعمال کیا۔تا کہ عوام میں ان کو مقبول کر سکیں۔ چونکہ سیاستدانوں کو صوبائی یا ملک گیر سطح پر ان کی تحریکیں مقبول کر دیتی ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس فوجی حکومتوں کو معاشرے میں اپنی جگہ بنانے کے لیے ایسے مصنوئی ہتھیاروں اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنی حکومت کو ہر لحاظ سے سند یافتہ ثابت کرنے کے لیے عوامی سند کی اور حمایت

کی ضرورت ہوتی ہے۔

مذکورہ تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان دوٹکڑے اچھی سیاسی قیادت کی کمی کی بدولت ہوا۔اس کا اثر تاریخ نویسی پر ہوا۔جن مصنفین نے حال میں رہتے ہوئے تاریخ لکھی اُن کے خیال میں بھی پاکستان کے پاس اچھی، فعال سیاسی قیادت نہیں ہے۔اسی طرح سے چند مصنفین نے تاریخ کو ماضی میں قید کر دیا ہے اور اپنی تحریروں کو مسلم فاتحین تک محدود رکھا۔تاکہ آمریت کو تمام جمہوری اداروں اور نظاموں سے مضبوط اور بہتر قرار دیا جا سکے۔

حاصل تحقیق یہ ہے کہ ابتدائی ادوار میں ۱۹۶۰ء کے بعد جو بھی مضامین، کتب، رسائل شائع ہوئے اور تاریخ مرتب کی گئی انھوں نے عوامی مزاج کو بھی " آمریت'' کا حامی بنا دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کو بھی ایسی داستانوں جن کے کردار غیر مرئی طاقت کے مالک ہوتے ہیں۔ایسی تاریخیں جو ایکشن سے بھرپور ہوتی ہیں۔اُن میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔اس کی ایک وجہ پاکستان کا جاگیردارانہ نظام اور قبیلائی فکری تناظر ہے۔حد تو یہ ہوئی کہ جمہوری ادارئے، حکومتیں جو آزادی رائے، تحریر و تقریر کا دعویٰ تو بہت کرتی ہیں۔لیکن افسوس یہ صرف ایک دعویٰ ہی ہوتا ہے مگر مزاجاً وہ بھی کسی " آمر " یا ڈکٹیٹر سے کم نہیں ہوتے۔انہیں بھی اختلافی نقطہء نظر یا عوامی حلقوں میں اپنے کسی بھی عمل یا اقدام کے لیے جوابدہ ہونا مشکل ہوتا ہے۔چونکہ ملٹری آفیسرز کے ہاں صرف حکم ہوتا ہے حکم عدولی نہیں ہوتی۔ایسا ہی حال کچھ ہماری قوم کا بھی ہے بلکہ ہر اُس شخص کا ہے جو ذرا سے بھی اختیارات رکھتا ہے۔

مراجع وحواشی

(۱) فضل مقیم خان، میجر جنرل، پاکستان کا المیہ ۱۹۷۱ء (راولپنڈی۔سن۔ن، آرمی ایجوکیشن پریس) ص.ا.

(۲) صفدر محمود، ڈاکٹر، سقوط مشرقی پاکستان (لاہور: ۱۹۷۲ء، مکتبہ جدید پریس) ص.پ.

(۳) فضل مقیم خان، ص.۱.۲.۳.

(۴) صفدر محمود، ص.۱۳.۱۴.۱۵.

(۵) فضل مقیم خان، ص.۵.

(۶) ایضاً، ص.۶.۷.

(۷) صفدر محمود، ص.۱۵.۱۶.

(۸) ایضاً، ص.۶.۷.

(۹) فضل مقیم خان، ص.۱۰.۱۱.

(۱۰) ایضاً، ص.۱۰.۱۱.

(۱۱) ایضاً، ص.۶۱.۶۲.

(۱۲) صفدر محمود، ص.۲۱.۲۲.

(۱۳) ایضاً، ص.۲۸.تا۳۱.

(۱۴) فضل مقیم خان، ص.۸.۹.

(۱۵) صفدر محمود، ص.۴۵.۴۶.

(۱۶) فضل مقیم خان، ص.۱۷.

(۱۷) صفدر محمود، ص.۴۸.

(۱۸) ایضاً، ص.۵۱.

(۱۹) فضل مقیم خان، ص.۱۱.

(۲۰) ایضاً، ص.۱۲.۱۳.

(۲۱) صفدر محمود، ص.۵۵تا۵۸.

(۲۲) ایضاً، ص.۵۹تا۶۳.

(۲۳) ایضاً،ص.۶۴.۶۵. (۲۴) ایضاً،ص.۶۶.

(۲۵) ایضاً،ص.۷. (۲۶) ایضاً،ص.۸۶.۸۷.

(۲۷) فضل مقیم خان،ص.۱۷.۱۸.۱۹. (۲۸) صفدر محمود،ص.۹۱.۹۲.

(۲۹) منیر احمد، جنرل یحییٰ خان (لاہور۔۱۹۹۹ء تخلیقات) ص.۲۴.

(۳۰) فضل مقیم خان،ص.۲۰.۲۱.۲۲. (۳۱) صفدر محمود،ص.۹۳.تا۱۰۸

(۳۲) ایضاً،ص.۱۱۰.تا۱۱۴. (۳۳) فضل مقیم خان،ص.۲۳.۳۴.

(۳۴) ایضاً،ص.۳۵.۳۶.۳۷ (۳۵) صفدر محمود،ص.۱۴۰تا۱۴۲.

(۳۶) ایضاً،ص.۱۴۶تا۱۴۸. (۳۷) فضل مقیم خان،ص.۴۷تا۶۷.

(۳۸) صفدر محمود،ص.۶۷.۶۸. (۳۹) فضل مقیم خان،ص.۲۹۴.۲۹۵.

(۴۰) صفدر محمود،ص.۸۰.تا۱۰۴. (۴۱) منیر احمد،ص.۶۹.۷۰.

(۴۲) صفدر محمود،ص.۱۶۴.تا۱۷۰. (۴۳) جلیس سلال،کورٹ مارشل (کراچی:۱۹۹۹ء،شاہدہ تبسم) ص.۱۲۷.

(۴۴) ایضاً،ص.۱۵۰.۱۵۱. (۴۵) ایضاً،ص.۱۵۸.

(۴۶) احمد سلیم،حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ (لاہور:۱۹۹۳ء،فرنیٹر پوسٹ پبلیشرز)،ص.۱۶۴.

(۴۷) غفور احمد، پروفیسر، پھر مارشل لاء آ گیا (لاہور:۱۹۸۸ء، جنگ پبلیشرز)،ص.۳۴.

(۴۸) احمد سلیم،ص.۴۰. (۴۹) ایضاً،ص.۱۳۳.

(۵۰) فضل مقیم خان،ص.۹۷